جون ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ : ساٹھ پیسے
سالانہ: چھ روپے (بارہ شلنگ)

Regd. No. L. 7360

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۶ | محرم الحرام ۱۳۸۲ھ | شمارہ ۶

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ	امین احسن اصلاحی	۲
تدبر قرآن		
تفسیر سورہ بقرہ	"	۵
مطالعہ حدیث		
مشکوٰۃ معہ	مولانا عبد الغفار حسن صاحب	۳۰
مقالات		
اسلام اور انسانی حقوق	مولانا ضیاء الدین	۳۸
مراسلہ و مذاکرہ		
نسخ سے متعلق دو سوال	امین احسن اصلاحی	۴۴
اقتباسات و تراجم		
حقیقت شناس ذہن کی منزل	جناب خالد مسعود صاحب	۴۸
تقریظ و تنقید		۵۱

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ میثاق
رحمانپورہ — اچھرہ
لاہور-۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر
کا پتہ
منیجر ہفت روزہ ندائے ملت
باغ گونگے نواب۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

افسوس ہے کہ ہماری خواہش اور کوشش کے علی الرغم میثاق کا یہ شمارہ کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بعض گھریلو انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے پورے دو ہفتے اپنے مستقر سے دور، ایک دیہات میں گزارنے پڑے اور اس دوران میں لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں چند دنوں سے کچھ بیمار ہوں۔ یہ دونوں باتیں مجبوری کی ہیں اس وجہ سے امید ہے کہ رسالہ کے قارئین اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے۔ ساتھ ہی ایک گزارش یہ بھی ہے کہ اس شمارے میں تفسیر کی جو قسط دی گئی ہے اس کی بعض بحثوں کو میں مزید مدلل کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ پرچہ کی کتابت ہو چکی ہے، نیز مراجعت کتب کے انتظار میں مزید تاخیر کا اندیشہ ہے اس وجہ سے اب اس کام کو کسی آئندہ فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ قارئین اگر کسی بحث میں کوئی خلا محسوس کریں تو اس کی طرف توجہ دلا دیں۔ میں اس کے لئے ممنون ہوں گا اور آئندہ اس خلا کو بھرنے کی کوشش کروں گا۔

(۲)

ہمارے ملک کے انتخابات پر بین الاقوامی شہرت رکھنے والے جریدہ ٹائم TIME کا یہ تبصرہ بڑا معنی خیز ہے۔

"چونکہ مغربی طرز کی سیاسی تنظیمات کے مقابلہ میں یہاں ووٹروں کی تعداد بہت کم تھی اس لئے انتخابی سرگرمیوں کے لئے عام طور پر قہوہ خانوں اور امیدواروں کے گھروں ہی کو مرکز بنایا گیا۔

سیاست دانوں کے اس اعلان کے بعد کہ ووٹروں اور ان کے گھر والوں کی ضیافت بھنے ہوئے گوشت اور مصالحہ دار پلاؤ سے کی جائے گی بعض گھروں میں کھانے والوں کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ حکومت کو ۳۵ مہمانوں سے زیادہ کی ضیافت پر پابندی سے اغماض برتنا پڑا۔ زیادہ کھاتے پیتے امیدواروں نے تو عالیشان کوٹھیاں اور کرایہ کے خدمت گار اور چوکیدار بھی حاصل کئے تاکہ انتخاب کی تاریخ سے پہلے دوسرے امیدواران کے ووٹروں تک نہ پہنچ سکیں۔"

آگے چل کر تبصرہ نگار صاحب لکھتے ہیں۔

"ایوب کی سب سے بڑی فتح رائے دہندوں کا بھاری اکثریت سے ان کٹر مسلمان انتہاپسندوں کو مسترد کر دینا ہے جو معاشرہ کی تطہیر اور ایوب خاں کی ان اصلاحات کو ختم کرنے کا دعوے لے کر اٹھے تھے جن کے ذریعے تعدد ازدواج اور شوہر کی ترنگ پر ایک ہی نشست کے رواجی نظام طلاق پر پابندی لگائی گئی ہے۔"

اس امر میں تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انتخابات میں بالعموم ان لوگوں کو ناکامی ہوئی جو مذہب کی نمائندگی کے دعویدار تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کہ "کٹر مسلمان انتہاپسندوں" کی شکست صدر ایوب کی نافذ کردہ عائلی اصلاحات کے حامیوں کی فتح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ انتخابات میں کامیاب ہوئے ان میں سے شاید ہی کوئی صاحب ایسے ہوں جو عائلی اصلاحات کے حامی کی حیثیت سے اپنے ووٹروں کے سامنے ظاہر ہوئے ہوں بلکہ ان میں سے ہر ایک نے، جہاں تک ہمیں علم ہے، ووٹروں سے یہی وعدہ کیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں پہنچ کر صدر ایوب کی نافذ کردہ اصلاحات کو تبدیل کرانے کی کوشش کریگا۔

رہا "کٹر مسلمان انتہاپسندوں" کا معاملہ تو ان کے لئے ہمارا مشورہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے بارہا دے چکے ہیں کہ وہ اگر انتخابات کی راہ سے اقتدار چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ابھی کچھ عرصہ وہ اپنی بھی اصلاح کریں اور اس معاشرہ کی بھی جس کے اندر وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے کہ ابھی نہ تو ان کے اندر شاید وہ صلاحیت پیدا ہوئی ہے جو ان کو دوسروں سے

متاثر کرنے والی ہو اور نہ اس معاشرے کے اندر وہ نظر ہی پیدا ہوتی ہے جو ان کی صالحیت کو دعیان صالحیت کے اس ہجوم میں پہچان سکے اس کام کیلئے لازماً کچھ عرصہ تک جد و جہد کرنی پڑیگی اور یہ ضروری ہے کہ یہ جد و جہد حضرات انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر ہو!

اگر ان حضرات کو ہمارا یہ مشورہ قبول نہیں ہے بلکہ وہ اسی معاشرہ کے اندر انتخابات کی راہ سے اقتدار حاصل کرنے کے آرزومند ہیں تو پھر ہماری ناچیز گزارش یہ ہے کہ وہ صرف ان اصولوں ہی کی قربانی پر اکتفا نہ کریں جو انہوں نے اسلام کے نام پر کبھی بنائے تھے اور بڑے اہتمام کے ساتھ جن کی تبلیغ کی تھی بلکہ ان چیزوں کا بھی اہتمام کریں جن کی طرف ٹائم کے تبصرہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً

— ووٹروں اور ان کے گھر والوں کی ضیافت کے لئے بھنے ہوئے گوشت اور مصالحہ دار پلاؤ کا"

— ووٹروں کو گھیرنے اور ان کو دوسرے امیدواروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے "کرایہ کے چوکیداروں اور خدمت گاروں کا"

— ووٹوں کے خریدنے کے لئے کافی سرمایہ کا۔ اس لئے کہ ان لوگوں کا خیال غلط ثابت ہو گیا جو کہتے تھے کہ چونکہ ووٹر کم ہیں اس وجہ سے دام زیادہ نہیں چڑھیں گے۔ اس کے برعکس معلوم ہوا کہ جو چیز بازار میں جتنی ہی کم ہوگی اتنی ہی اس کی قیمت زیادہ ہوگی۔

اگر ان چیزوں کا اہتمام ہمارے ان دوستوں نے کر لیا تو امید ہے کہ اگلے انتخابات تک ہمارا معاشرہ ان کی پذیرائی کے لئے بھی تیار ہو جائے گا اور عجب نہیں کہ ان کی کھلائی ہوئی دعوتوں کے باب میں ارباب اقتدار اس اغماض سے بھی کام لیں جس کی طرف ٹائم کے تبصرہ نگار نے اشارہ کیا ہے اس لئے کہ اسلامی فقہ کا مشہور اصول ہے الضرورات تبیح المحظورات (ضرورت ممنوعات کو جائز کر دیتی ہے)

(باقی بر صفحہ ۵۶)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۲۶)

۵۰ - آگے کا سلسلۂ کلام (۱۲۲ - ۱۴۱)

اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لئے قبولِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ پندار تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس وجہ سے ہدایت ان کی ہدایت اور مذہب ان کا مذہب ہے۔ وہ اپنے دائرہ سے باہر نہ کسی کے لئے نجات کے قائل تھے نہ کسی نبوت و رسالت کا تصور رکھتے تھے۔ نجات اور ہدایت حاصل کرنے کا واحد راستہ ان کے ہاں یہ تھا کہ آدمی یہودی بنے یا نصرانی۔ قرآن نے اوپر مختلف پہلوؤں سے ان کے اس زعم کی تردید فرمائی۔ اب آگے ان کے ان مزعومات کی تردید کے لئے ان کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندوں کی سرگزشتِ حیات کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی رسالت کی تائید اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے تمام دعاوی کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں ہی کے مورثِ اعلیٰ اور پیشوائے روحانی تھے، اس وجہ سے تاریخ کا یہ حصہ یکساں طور پر سب کے لئے حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس سورہ کے آغاز سے بنی اسرائیل اور ضمناً بنی اسمٰعیل کے ساتھ جو بحث شروع ہوئی تھی وہ اس مقام پر آ کر اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔

یہاں جو باتیں قرآن نے اس سرگزشت کی روشنی میں واضح کی ہیں ان کی تفصیل تو آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی لیکن ہم خاص خاص اصولی باتوں کی طرف یہاں اشارہ کئے دیتے ہیں تاکہ کلام کا نظم اور تسلسل نگاہ کے سامنے آجائے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت و پیشوائی کا جو منصب اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا تھا وہ ان کو وراثت کے طور پر نہیں ملا تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا۔ پہلے اللہ تعالےٰ نے مختلف امتحانوں میں ڈال کر ان کی اطاعت و وفاداری کی اچھی طرح جانچ کی۔ جب وہ اس جانچ میں پورے اترے تب ان کو یہ منصب عطا ہوا۔ اس وجہ سے یہ منصب تمام تر صفات پر مبنی ہے۔ اس کو کوئی تعلق بھی نسب اور خاندان سے نہیں۔ اس وجہ سے ان کی ذریت میں سے بھی وہی لوگ اس منصب کے سزاوار ہوں گے جو ان صفات کے حامل ہوں جو اس منصب کے شایانِ شان ہیں۔ بدعہد اور نافرمان لوگ اس کے حقدار نہیں ہو سکتے

۲۔ بیت اللہ کو اللہ تعالےٰ نے تمام ذریت ابراہیم کے لئے مرکز قرار دیا، اس کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اس کی تولیت سپرد ہوئی۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اس گھر کی تعمیر کے وقت اپنی ذریت میں سے ایک امت مسلمہ اٹھانے اور ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی۔

۴۔ یہ پیغمبرؐ اسی دعائے ابراہیمی کے مظہر اور اسی ملت ابراہیمی کے داعی ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ ملتِ ابراہیمی کی پیروی کا دعوے رکھتے ہوئے ان کی دعوت سے گریز اختیار کر رہے ہیں وہ خود اپنے آپ کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں۔

۵۔ اسی ملتِ اسلام کی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اپنی اولاد کو کی اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد نے اسی ملت پر جینے اور اسی ملت پر مرنے کا حضرت یعقوبؑ سے عہد کیا۔

۶۔ ان تمام واقعات و حقائق کا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب یہودیت یا نصرانیت کے تعصب میں مبتلا ہونے کے بجائے اس ملت ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، خدا کے نبیوں کے درمیان کوئی تفریق نہ کریں بلکہ اس دینِ اسلام کو اختیار کریں جو مشترک طور پر تمام نبیوں اور تمام رسولوں کا دین ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں وہ اسلام کے رنگ کو اختیار کریں اور یہی رنگ اللہ کا رنگ ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ جو لوگ اس رنگ سے الگ کوئی رنگ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسولوں سے الگ اپنی پارٹی بنانے کے درپے ہیں۔

۷۔ یہ دعوےٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور ان کے سلسلہ کے دوسرے انبیاء علیہم السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ جو لوگ اس قسم کے دعوے کر رہے ہیں وہ حقیقت پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان نبیوں کے دین و مذہب سے ان مدعیوں کے مقابل میں زیادہ باخبر ہے۔

۸۔ آخری بات جو اس سلسلۂ کلام میں بطور ٹیپ کے بند کے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ دو مرتبہ کہی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے جن آباؤ اجداد پر تم تکیہ کئے ہوئے ہو وہ اپنی زندگیاں گزار چکے اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئے۔ نہ ان کے کارناموں کا کریڈٹ تم کو ملے گا اور نہ ان کے کسی عمل کے بارے میں تم سے مواخذہ ہونا ہے۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۝۱۲۲ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا تَنۡفَعُہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ۝۱۲۳ وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ۝۱۲۴ وَ اِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمۡنًا ؕ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ

مَقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۲۵ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ
بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۲۶ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۲۷ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۲۸ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۲۹ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ
اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۳۰ اِذْ قَالَ لَهٗ
رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۳۱ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ
بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۳۲ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ
قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ
اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۳۳
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ
عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۳۴ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ
مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۳۵ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ
اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۳۶ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ
فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِىْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۳۷ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ
لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۳۸ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ
اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۳۹ اَمْ تَقُوْلُوْنَ
اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ
قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ
اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۴۰ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۴۱

اے بنی اسرائیل میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں اہلِ عالم پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا، نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی کی جا سکے گی۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں، فرمایا، بے شک میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ اس نے پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکنِ ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے دعا کی کہ اے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو، جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما، فرمایا جو کفر کریں گے میں انہیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا، پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیل دوں گا اور

وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہماری جانب سے یہ دعا قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔

اے ہمارے رب ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور کون ہے جو ملت ابراہیم سے اعراض کرے مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے، ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرہ میں ہوگا۔ جب کہ اس کے رب نے اس کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دے۔ اس نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگار عالم کے حوالہ کیا۔

اور ابراہیم نے اسی ملت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اے میرے بیٹو، اللہ نے تمہارے لئے دین اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر۔

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا۔ جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کروگے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤ اجداد ــ ابراہیم اسمٰعیل اور اسحٰق ــ کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو کچھ تم نے کمایا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہیں

ہوگا۔

اور کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤگے کہو بلکہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یک سو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسٰی و عیسٰی اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر وہ درپے مخالفت ہیں۔ ان کے مقابل میں تمہارے لئے اللہ کافی ہوگا وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

کہہ دو، یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دو، کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہو، حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے، وہی تمہارا بھی رب ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اور ہم خالص اسی کے لئے ہیں۔

کیا تم دعوے کرتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے۔ پوچھو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائیں۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہ ہوگا۔

۵۱۔ الفاظ اور جملوں کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ...... وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ | یہ دونوں آیتیں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ اوپر بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ہم ان پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ ملاحظہ

ہو تفسیر آیات ۱۲۴ ۔ ۱۴۴

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ ..... لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ | ابتلاء کے معنی جانچنے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ یہ ابتلاء بندوں کی تربیت اخلاقی کے لئے اللہ تعالٰے کی ایک سنت ہے۔ اسی چیز سے بندوں کی وہ صلاحیتیں ابھرتی اور نشوونما پاتی ہیں جو ان کے اندر اللہ تعالٰے نے ودیعت فرمائی ہیں اور اسی سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نرم اور سخت، سرد اور گرم، خوش کن اور رنجدہ، حوصلہ افزا اور ہمت آزما دونوں طرح کے حالات کے ذریعے سے ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے مقصود بندے کو دکھ میں مبتلا کرنا نہیں ہوتا بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا صرف اس کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ آگے اس پر مفصل بحثیں آئیں گی۔

کلمات کلمہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی مفرد لفظ کے بھی آتے ہیں اور پوری بات کے بھی۔ یہاں کلمات سے مراد اللہ تعالٰے کے وہ احکام ہیں جو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت واستقامت کے امتحان کے لئے ان کو دیئے اور انہوں نے بے چون وچرا ان کی تعمیل کی۔ مثلاً انہوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں عین اپنی قوم کے بتکدے میں توحید کی اذان دی اور جو بت صدیوں سے معبود بن کر پج رہے تھے ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ان کو دینِ آبائی کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا، وہ بے خطر اس آگ میں کود پڑے۔ ایک جابر بادشاہ نے ان کو دینِ حق سے پھیرنا چاہا، انہوں نے حجتِ ابراہیمی سے اس کے چھکے چھڑا دیئے۔ ان کو خاندان، جائداد اور قوم ووطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کا حکم ہوا، وہ سب کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ ان کو دشتِ غربت میں اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری چلا دینے کا حکم ہوا، انہوں نے بے دریغ اس بازی کیلئے بھی آستینیں چڑھالیں اور سیزدہ سالہ فرزند کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں جان بازی وجاں سپاری کے اس قسم کے عظیم کارناموں سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔ ہم نے صرف چند واقعات کی طرف بطورِ مثال اشارہ کر دیا ہے۔

یہاں اللہ تعالٰے نے اپنے احکام وہدایات کی تعبیر کے لئے کلمات کا جو لفظ استعمال

فرمایا ہے اس میں بلاغت کا ایک خاص نکتہ مضمر ہے۔ وہ یہ کہ لفظ کلمہ ایک قسم کے اجمال وابہام کا حامل ہے۔ یہ لفظ کلمہ کُن کی طرح ایک واجب التعمیل حکم کو تو مخاطب کے سامنے رکھ دیتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ اس کا فلسفہ، اس کا صلہ اور اس کا انعام بھی بیان ہو۔ وفاداری اور اطاعت کے امتحان کے لئے اس طرح کے احکام سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے جو بندہ اس طرح کے امتحان میں بازی لے جاتا ہے اس کا اجر وانعام بھی بہت بڑا ہے۔ مثلاً اللہ تعالٰے نے خواب میں ایک اشارے کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کو ذبح کر دینے کا حکم دے دیا۔ نہ اس کی علت وحکمت واضح فرمائی نہ اس کا اجر وانعام بیان فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تو اس خواب کو صرف ایک خواب کا درجہ بھی دے سکتے تھے اور چاہتے تو اس کی کوئی تعبیر بھی نکال سکتے تھے لیکن جس طرح اس کائنات کی ہر چیز خدا کے کلمۂ کُن کی تعمیل کرتی ہے، اس کو نہ تو اس کے فلسفہ سے بحث ہوتی، نہ اس کے اجر وثواب سے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے ہر کلمہ کی تعمیل کی نہ اس کا فلسفہ پوچھا، نہ اس کا اجر وثواب معلوم کیا۔ حکم ہوا آگ میں کود پڑو، کود پڑے۔ حکم ہوا قوم ووطن کو چھوڑ دو، چھوڑ دیا۔ حکم ہوا بیٹے کی گردن پر چھری چلا دو، اس کو پچھاڑ دیا۔ ان امتحانی احکام کی اس مخصوص نوعیت کی وجہ سے قرآن نے ان کو کلمات کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

یوں تو ان امتحانات میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا لیکن خاص طور پر بیٹے کی قربانی والا امتحان تو ایک ایسا امتحان تھا جس میں پورا اترنا تو الگ رہا اس کا تصور بھی ایک عظیم امتحان تھا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی پورے اتر گئے تو اللہ تعالٰے نے ان سے یہ وعدہ فرمایا کہ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ یہ ایک ہی وعدہ بیک وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے، ایک تو اس پر کہ حضرت ابراہیمؑ ان سب کے پیشوا ہوں گے۔ اس عظیم انعام کے حقدار وہ اس وجہ سے قرار پائے کہ انہوں نے اللہ کی خاطر نہ صرف اپنے خاندان اور اپنی قوم کو چھوڑا بلکہ ایک دشتِ غربت میں اپنے اس اکلوتے فرزند کو بھی قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے جو اس بڑھاپے

اور اس تنہائی میں ان کی تمام تمناؤں کا واحد مرکز تھا۔ تورات میں اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح کے خاص اس حصہ میں یہود نے بہت سی تحریفات کردی ہیں تاہم یہ وعدہ تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۲۲۔

اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کردوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی۔ اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

اس وعدے کے ایفاء میں اللہ تعالےٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں کی نسل سے عظیم قومیں پیدا کیں جن کے مورثِ اعلیٰ اور روحانی پیشوا بلا اختلاف حضرت ابراہیمؑ تھے۔ پھر ان کے اندر نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری ہوا ان میں جلیل القدر بادشاہ پیدا ہوئے جو دشمنوں کے پھاٹکوں کے فاتح بنے۔ پھر انہی کی ایک شاخ میں پیغمبر خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت ہوئی جن کے واسطے سے تمام دنیا کو ایمان و ہدایت کی برکت نصیب ہوئی۔

اللہ تعالےٰ نے یہ وعدہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تو انہوں نے سوال کیا کہ امامت و پیشوائی کا یہ عہد انہی کے ساتھ خاص ہے یا ان کی ذریت بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد قرآن میں صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جو دوسروں پر ظلم ڈھانے والے ہوں بلکہ اس سے بیشتر وہ لوگ مراد لئے گئے ہیں جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں مثلاً۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (پس ان میں سے کتنے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے اور کتنے میانہ رو ہیں) فاطر ۳۲۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (اور ان دونوں کی ذریت میں ٹھیک عمل کرنے والے بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم کرنے والے بھی) ۱۱۳۔ صافات۔

مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ تمہاری ذریت میں سے تمہاری روش پر قائم اور میری دی ہوئی خیریت و ہدایت پر استوار رہیں گے وہ تو تمہارے بعد اس امامت کے وارث ہوں گے۔ لیکن جو بدعہدی اور نافرمانی کرکے شیطان کی راہ پر چل پڑیں گے وہ اس امامت میں سے کوئی حصہ نہیں پائیں گے۔

یہ تصریح یہاں اس لئے کی گئی ہے تاکہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ان کو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت ہونے پر جو ناز ہے اور جس کے سبب سے وہ ایمان اور عمل کی تمام ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھے بیٹھے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ ابراہیمؑ کی وراثت میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اسی روز واضح کردی تھی جس روز ان کو اس منصب امامت پر سرفراز فرمایا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اوپر ہم نے تورات کا جو حوالہ نقل کیا ہے اس میں یہ تصریح بھی ضرور موجود رہی ہوگی لیکن چونکہ یہ بات یہود کے منشاء کے خلاف تھی اس وجہ سے انہوں نے جس طرح اس سلسلہ کے واقعات میں دوسری بہت سی تبدیلیاں کردیں۔ اسی طرح اپنی خواہش کے خلاف پاکر اس تصریح کو بھی انھوں نے حذف کردیا۔ استاذ امامؒ نے اپنے رسالہ ذبیح میں ان تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے۔ تفصیل کے طالب اس رسالہ کو ضرور پڑھیں۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ ...... وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ بیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔ قرآن مجید میں اس شکل میں یہ لفظ خانہ کعبہ ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۲ میں اس کو بیت ایل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل عبرانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔

مثابۃ کے معنی مرکز و مرجع کے ہیں، جس کی طرف سب رجوع کریں، جس کے ساتھ سب وابستہ ہوں، جو سب کا مرکز اور سب کا قبلہ ہو۔

للناس سے یہاں مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں ہوا ہے یعنی وہ تمام ذریت ابراہیمؑ جس کی امامت و پیشوائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

حاصل ہوگی عام اس سے کہ وہ حضرت اسحٰق کی نسل سے ہوں یا حضرت اسمٰعیل ؑ کے سلسلہ سے ہوں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی تمام ذریت کا پیشوا بنانے کا فیصلہ کیا گیا اسی طرح یہ فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خدا کی عبادت کے لئے جو گھر وہ بنائیں گے وہ تمام ذریت ابراہیمؑ کا مرکز اور قبلہ ہوگا اور پھر ذریت اسمٰعیل علیہ السلام کے واسطہ سے، جیسا کہ آگے ذکر آرہا ہے، تمام دنیا کی قومیں اس گھر کی برکتوں میں سے حصّہ پائیں گی۔

استاذ امام مولانا فراہیؒ اس مسئلہ میں نبی تحقیق یہ بیان فرماتے ہیں۔

"تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو شروع ہی سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ اپنی بڑی قربانیوں کا قبلہ مکہ معظمہ کی سمت کو قرار دیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قربانی کے لئے ضروری تھا کہ وہ معبد میں خداوند کے حضور پیش کی جائے۔ فصل دوم حرف ی میں ہم بتا چکے ہیں کہ جس قربانی کا نام ان کے ہاں قدس الاقداس تھا اس کا رخ جنوب کی سمت ہونا ضروری تھا۔ اسی طرح سالانہ قربانی جو ان کے ہاں سب سے بڑی قربانی خیال کی جاتی تھی اس کا رخ بھی جانب جنوب ہی ہوتا۔ یہود یا تو اس معاملہ کے اصل راز سے بے خبر تھے جیسا کہ فصل دوم حرف ی میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں یا انہوں نے بالقصد اس معاملہ کو کریدنا نہیں چاہا۔ بلکہ اپنی عادت کے مطابق چاہا کہ اس پر پردہ ہی پڑا رہے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

حالانکہ یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ ان کے خیمہ عبادت کا رخ ابتداء سے جانب شمال تھا۔ دیکھو سفر خروج ۲۷ : ۹

"مسکن کا گھر جنوب کی جانب برکت حاصل کرنے کے رخ پر بنایا جائے۔ نیز اسی سفر خروج کے باب ۴۰ آیت ۲۱-۲۲ میں ہے

اور میز کو اس پردے کے باہر مسکن کی شمالی سمت میں خیمۂ اجتماع کے اندر رکھا اور اسی پر خداوند کے حضور روٹی سجا کر رکھی جیسا کہ خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور خیمۂ اجتماع کے اندر ہی میز کے سامنے مسکن کی

جنوبی سمت میں شمعدان رکھا۔"

ہمارے نزدیک اس ساری ترتیب کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب یعنی مکہ معظمہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب ہی کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اس لئے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمالی جانب کھڑا ہوتا تاکہ اس کا رخ مسکن ربانی کی طرف ہو سکے جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ لازماً خانۂ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس کے پاس ہی مسکن اسمٰعیل بھی ہے۔"

(ملاحظہ ہو رسالہ ذبیح فصل ۱۵)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جس طرح ہماری نمازوں اور قربانیوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اسی طرح ابتدا ہی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت کی عبادت و قربانی کا قبلہ بھی خانہ کعبہ ہی کو قرار دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ چنانچہ اسی رخ پر ان کا خیمہ عبادت بھی تھا اور پھر بعد میں اسی رخ پر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی لیکن یہود نے محض تعصب کی وجہ سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

آگے اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں۔

"ہمارے مذکورہ دعاوی کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسمٰعیلؑ کے مسکن کو قرار دیا۔ چنانچہ تورات سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۲۵-۱۸ میں ہے

"اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے

جس سے اسور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے"۔

اور پیدائش ۱۶: ۱۲ میں ہے۔

"وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا"۔

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے، اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد ماسوا بنی اسمٰعیل کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی۔ پس حضرت اسمٰعیل ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلہ کے سمت میں تھی۔ ہمارے نزدیک اس بات کو ماننے میں کسی تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالےٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد اس امامت کے وارث حضرت اسمٰعیل ہوئے۔

قرآن مجید نے اس معاملہ کی طرف بعض اشارات کئے ہیں[1]۔ (آگے مولاناؒ نے وہی آیت نقل فرمائی ہے جو یہاں زیر بحث ہے)

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (اور مسکن ابراہیم کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ) یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے ہی کی مزید وضاحت ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ "ہم نے کہا" یا "ہم نے حکم دیا" کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں جملوں میں ایک ہی بات دو مختلف پہلوؤں سے کہی گئی ہے۔ پہلے یہ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے بیت اللہ کو تمام اولادِ ابراہیمؑ کے لئے مرکز و قبلہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ پھر یہ فرمایا کہ اسی فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لئے ابراہیمؑ اور اولادِ ابراہیمؑ کو یہ حکم ہوا کہ مسکن ابراہیمؑ کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ۔

یہاں آیت میں مقامِ ابراہیمؑ کا لفظ آیا ہے۔ مقام سے کیا مراد ہے، علمائے تفسیر سے

[1] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کا رسالہ ذبیح فصل ۱۲

اس بارے میں دو قول منقول ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرے گروہ[1] کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ اس تاویل میں وسعت و جامعیت کے ساتھ ساتھ خاص اہمیت رکھنے والا پہلو یہ ہے کہ نظم کلام کے اقتضا سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرنے والی ہے جس کے لئے یہ بات یہاں کہی گئی ہے۔ یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہی گھر تمام اولاد ابراہیمؑ کا قبلہ رہا ہے اس لئے کہ یہی گھر ہے جو اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے اس مستقر میں تعمیر کیا جس میں ہجرت کے بعد انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ سکونت اختیار کی۔

یہ مسئلہ ہمارے اور یہود کے درمیان ایک بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ یہود نے خانہ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لئے واقعہ قربانی میں بھی اور ان کی سرگذشت ہجرت میں بھی نہایت بھونڈی قسم کی تحریفات کر دی ہیں اور اس طرح انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں نہ کہ حضرت اسمٰعیل، جس جگہ قربانی کی وہ جبل یروشلم ہے نہ کہ مروہ، خدا کی عبادت کے لئے انہوں نے جو گھر بنایا وہ بیت المقدس ہے نہ کہ بیت اللہ۔ انہوں نے جس جگہ ہجرت کے بعد سکونت اختیار کی وہ کنعان ہے نہ کہ جوارِ خانہ کعبہ۔ ان بیانات کی تصدیق یا تردید کا واحد ذریعہ چونکہ تورات ہی ہے اور تورات میں یہود نے اپنے حسبِ منشا، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، تحریف کر ڈالی، اس وجہ سے اصل حقائق سے پردہ اٹھانا بڑا مشکل کام تھا لیکن ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے یہود کی ان تمام تحریفات کا پردہ خود تورات ہی کے دلائل سے اپنے رسالہ ذبیح میں بالکل چاک کر کے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے تورات ہی کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحاقؑ کی والدہ کو تو کنعان میں

[1] واضح رہے کہ اس گروہ میں ابن عباس، مجاہد اور عطا جیسے اکابر علم تفسیر شامل ہیں۔

چھوڑا اور خود حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ ایک غیر آباد جگہ تھی اس وجہ سے انھوں نے یہاں سات کنوئیں کھودے اور درخت لگائے۔ یہیں ان کو خواب میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسمٰعیل کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اس حکم کی تعمیل کی۔ اسی پہاڑی کے پاس بیت اللہ کی تعمیر ہوئی اور اسی کے پاس انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کیا۔ پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جو خانہ کعبہ سے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحاقؑ کو دیکھنے کے لئے بھی جانا آسانی سے ممکن ہو سکے۔

مولاناؒ نے یہ ساری باتیں تورات کے نہایت ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کر دی ہیں۔ ہر سوال پر اصل کتاب کے اقتباسات پیش کرنے میں طوالت ہے اس وجہ سے ہم نے صرف خلاصۂ بحث اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں وہ مولاناؒ کے مذکورہ رسالہ کا مطالعہ کریں۔

ظاہر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے قیام اسی علاقہ میں فرمایا نہ کہ شام میں تو ان کو نماز کے لئے ایک مرکز کی تعمیر بھی اسی علاقہ میں کرنے کا حکم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں انہوں نے اس بیت اللہ کی تعمیر کی جس کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بیت ایل کے نام سے ہوا ہے۔ بیت اللہ اور بیت ایل دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں۔ ایل کے معنی عبرانی میں اللہ کے ہیں۔ اس بیت ایل سے اگر یہود بیت المقدس کو مراد لیتے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ اس سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن نہیں بنایا یہود کے اس دعوے کو جھٹلانے والی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر بالاتفاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیکڑوں سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ہوئی ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی اسی قدامت اور اولیت کی وجہ سے قرآن نے اس کو "بیت عتیق" اور "اول بیت" کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (۹۷-آل عمران) (بے شک پہلا گھر جو لوگوں — اولادِ ابراہیمؑ — کے لئے تعمیر ہوا وہی ہے جو بکہ میں ہے، مبارک اور تمام

ف بکہ کے معنی شہر کے ہیں۔ قدیم صحیفوں میں مکہ کے لئے یہی لفظ وارد ہے۔ یہود نے (باقی اگلے صفحہ پر)

عالم کے لئے سرچشمۂ ہدایت۔ اس میں اس کی اولیت کی نہایت واضح نشانیاں ہیں، یہ مسکن ابراہیمؑ ہے (اور اس کی روایت ہے کہ) جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا)

یہاں بیت اللہ کو مُصَلّٰی کے لفظ سے جو تعبیر فرمایا ہے تو اس سے اس گھر کے اصل مقصدِ تعمیر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ نماز کا مرکز ہو گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جوار میں حضرت اسمٰعیل کو بساتے وقت دعا بھی یہی کی تھی کہ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (اے رب میں نے ان کو اس لئے یہاں بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں) لیکن دورِ جاہلیت میں اس کے مشرک اور مبتدع متولیوں نے اس کو بدعات کا ایک اڈہ بنا لیا اور ان کی نماز پھونک مارنے اور تالی بجانے کی ایک بت پرستانہ رسم بن کر رہ گئی۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہاں مُصَلّٰی کے لفظ میں ایک اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ذریتِ ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں نے اپنے قبلہ کے بنیادی مقصد کو ضائع کر دیا۔ف اور اب خدا نے اپنے اس نبی کو بھیجا ہے جو اس کے اصل مقصد کی تجدید کر رہا ہے۔

وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ الْاٰیَۃ۔ عَھِد جب اِلٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی پر کوئی ذمہ داری ڈالنے یا اس کو کسی شرط کا پابند کرنے کے آتے ہیں مثلاً وَلَقَدْ عَھِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا (۱۱۵-طٰہٰ) (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک شرط کا پابند کیا تو وہ بھول بیٹھا اور ہم نے اس میں ارادہ کی مضبوطی نہیں پائی) اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۰) تحریف کر کے اس کو وادی بکا کر دیا ہے۔ متعلق آیت کی تفسیر کے تحت ہم اس تحریف پر بحث کریں گے (حاشیہ صفحہ ہذا)

ف یہ ملحوظ ہے کہ یہود نے جس طرح اپنے دینی لٹریچر سے خانہ کعبہ کے ذکر کو خارج کر دیا اسی طرح نماز کو بھی انہوں نے بالکل خارج کر دیا۔ ان کے ہاں اگر کوئی چیز ہے تو قربانی ہے۔ ان کے معبد کی بھی اصل حیثیت مرکزِ نماز کی نہیں بلکہ قربان گاہ کی ہے۔ ہمیں کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے نماز کی نعمت سے محروم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنے اصل قبلہ خانہ کعبہ سے اپنا تعلق توڑ لیا۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ (یٰس ۶۰) (کیا میں نے تم کو اس شرط کا پابند نہیں کیا تھا، اے آدم کے بیٹو! کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرو گے) پس عَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خانہ کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری ڈالی اور ان کو اس شرط کا پابند کیا کہ وہ اس گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھیں۔

پاک صاف رکھنے سے مقصد ظاہر ہے کہ ان ساری چیزوں سے پاک صاف رکھنے کے ہیں جو اس گھر کے مقصد تعمیر کے منافی ہوں عام اس سے کہ وہ گندگی و نجاست ہو جس سے عبادت گزاروں کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو، یا ارباب لہو و لعب کے ہنگامے ہوں جن سے ان کی یکسوئی میں خلل واقع ہو یا اصنام و اوثان ہوں جو خدا کے گھر کو شرک و بت پرستی کا گڑھ بنا کے رکھ دیں۔ ان ساری چیزوں سے اس گھر کو پاک رکھنے کی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ پر ذمہ داری ڈال دی گئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا کیا لیکن بعد میں ان کی اولاد جب شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئی تو اس نے اس گھر کی تولیت کی اس شرط کے برعکس اس کے کونے کونے میں بتوں کو لا بٹھایا اور ان لوگوں کو اس گھر سے نہایت ظلم اور بے دردی سے نکالا جو اس کو از سر نو ذکر الٰہی کے زمزموں، طواف و اعتکاف کی رونقوں اور رکوع و سجود کی جبہ سائیوں سے آباد و معمور کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے یہاں خانہ کعبہ کی ابتدائی تاریخ کی اس حقیقت کی طرف اسی لئے اشارہ فرمایا ہے کہ قریش اس گھر سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں لیکن جب انہوں نے ان کو سمجھنے سے انکار کر دیا تو بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کی تولیت کے منصب سے ان کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ (توبہ ۱۷-۱۸) (مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں۔ درآنحالیکہ وہ خود اپنے کفر پر گواہ ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے تمام اعمال اکارت گئے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے یہی ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں)

یہاں اس گھر کو تین چیزوں کے لئے خاص کرنے کا حکم ہوا ہے۔ طواف، اعتکاف اور رکوع و سجود۔

طواف سے مراد خانہ کعبہ کے ارد گرد پھیرے لگانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس کا وہ طریقہ واضح فرما دیا ہے جو اس کا اصل ابراہیمی طریقہ ہے۔ طواف درحقیقت نماز کی ایک قسم ہے لیکن یہ نماز صرف خانہ کعبہ ہی کے پاس ادا ہو سکتی ہے اس کے سوا کہیں اور ادا نہیں ہو سکتی۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے فرمایا۔ وقار و ادب کے حدود کے اندر رہتے ہوئے محبت الٰہی کے جذبات جس حد تک اس نماز میں ابھرتے ہیں بس اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ شمع و پروانہ کی حکایت طواف میں ایک حقیقت بن جاتی ہے بشرطیکہ آدمی کے اندر حیاتِ ایمانی کی رمق ہو۔

عاکف، عکوف سے ہے جس کی اصل روح دوسری چیزوں سے صرف نظر کر کے کسی خاص چیز کو پکڑ لینا ہے۔ اسی سے اعتکاف ہے جو دھیان گیان اور ذکر و فکر کی عبادت ہے۔ بندہ ہر چیز سے کٹ کر اپنے رب کی یاد کے لئے گوشہ نشین ہو جائے یہ اعتکاف ہے۔ اس کی صحیح شکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے واضح فرما دی ہے۔ جس طرح طواف محبت الٰہی کے جذبات ابھارنے کے لئے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے اسی طرح اعتکاف ذکر الٰہی پر عقل اور دل کو جمانے کے لئے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے۔

رکع راکع کی جمع ہے اور سجود ساجد کی۔ رکوع اور سجدہ کی لغوی تحقیق آیات ۴۳ و ۴۲ کی تفسیر کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ دونوں لفظ نماز کی تعبیر کے لئے وارد ہوئے ہیں۔ نماز کی تعبیر رکوع اور سجود سے دو اہم حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ دونوں چیزیں نماز کے قدیم ترین اور اہم ترین ارکان میں سے ہیں۔ نماز کی ظاہری ہیئت میں جو تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہوں لیکن یہ دونوں چیزیں جس طرح ہماری نمازوں میں شامل ہیں اسی طرح ابراہیمی نماز میں بھی شامل تھیں۔ دوسری یہ کہ نماز سے صرف ذکر و فکر ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کی مخصوص صورت و ہیئت بھی مطلوب ہے اور اس کی صورت و ہیئت کا اصل جمال اس کے رکوع و سجود میں ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ ...... وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ | رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ

مِنَ الثَّمَرٰتِ (اے میرے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے ساکنوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) آمن کے معنی مامون و مطمئن کے ہیں۔ یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین کے لئے فرمائی ہے جس پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بسایا اور جہاں حرم کی تعمیر کی۔ یہ علاقہ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا۔ خانہ بدوش قبائل پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسموں کے تغیر کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ معاش کا ذریعہ یا تو گلہ بانی تھا یا شکار یا پھر لوٹ مار۔ اس وجہ سے اس سرزمین کے دو مسئلے خاص طور پر حضرت ابراہیم کے زمانے میں بڑے اہم تھے ایک امن کا دوسرا غذا کا۔

حضرت ابراہیمؑ کی مذکورہ دعا انہی دو چیزوں کے لئے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا جس طرح قبول فرمائی اور اس کی جو برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت اور اس علاقہ کے باشندوں کیلئے ظاہر ہوئیں وہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ اور محسوس حقیقت ہے کہ کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ پھر عجیب ایمان پرور ماجرا یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے واسطہ ہی سے لوگوں کو بخشیں۔ اس دروازے کے سوا انہیں کسی اور واسطہ اور ذریعہ کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قرآن میں اس گھر کو جو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا گیا ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

اب آیئے دیکھئے کہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اس سرزمین کے بسنے والوں کے لئے کن کن شکلوں میں پوری ہوئی۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بیت اللہ کو بلکہ اس سرزمین کو بھی جہاں بیت اللہ واقع ہے محترم قرار دے دیا۔ اس میں لڑنا بھڑنا، کسی پر حملہ کرنا، کسی کو قتل کرنا، سب یک قلم ممنوع ہو گیا۔ جو شخص بھی اس میں داخل ہو گیا وہ خدا کی امان میں داخل ہو گیا۔ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں رہا کہ اس سے کسی قسم کا تعرض کر سکے۔ اس کے حدود سے باہر خطرہ ہی خطرہ تھا لیکن اس کے اندر ربِ ابراہیمؑ نے امن ہی امن پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے دائرہ میں کسی جانور کو بھی کوئی اذیت پہنچانا حرام ٹھہرا۔ اپنے اسی احسان کا ذکر اللہ تعالیٰ

نے قریش کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۶۷۔ عنکبوت) (کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے ایک محفوظ حرم بنا دیا درآنحالیکہ ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لئے جاتے ہیں)

دوسری یہ کہ اس گھر کے حج و زیارت کیلئے سال کے چار مہینے بھی محترم قرار دے دیئے گئے۔ ان مہینوں میں لڑنا بھڑنا اور خونریزی و فساد بالکل ممنوع ہو گیا۔ وحشی سے وحشی لوگ بھی ان کے احترام میں اپنی تلواریں میانوں میں کر لیتے تھے اور خطرناک سے خطرناک علاقے بھی بالکل پرامن ہو جاتے تھے تاکہ لوگ ملک کے ہر گوشے اور کونے سے حج و عمرہ کے لئے آسکیں اور پھر امن و سلامتی کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں۔

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو بیرونی دشمنوں کے خطرات سے بھی بالکل مامون و محفوظ بنایا۔ اس گھر کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ بیرونی دشمنوں کو اول تو اس پر حملہ آور ہونے کی کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی اور اگر کبھی کسی نے یہ جسارت کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی قدرتِ قاہرہ سے نہایت عبرتناک سزا بھی دی ہے۔ ابرہہ کی فوجوں کا جو حشر ہوا وہ تاریخ کی بھی ایک مشہور حقیقت ہے اور اس کا ذکر قرآن کی سورۂ فیل میں بھی ہوا ہے۔

اسی طرح اس گھر کی برکت نے اس سرزمین کے ساکنوں کے لئے معاشی فراغت کے دروازے بھی کھول دیئے۔ اس کے بھی بعض پہلوؤں کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ مرکزِ حج قرار پا جانے کی وجہ سے اس سرزمین کی طرف لوگوں کا رجوع بہت بڑھ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت جتنی ہی پھیلتی گئی اسی حساب سے لوگ گوشہ گوشہ سے حج و زیارت کے لئے آنے لگے۔ اور پھر اسی اعتبار سے، قدرتی طور پر تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم کی چیزیں مکہ کے بازار میں پہنچنے لگیں اور یہاں سے جو چیزیں باہر جا سکتی تھیں وہ باہر نکلنے لگیں۔ اس گھر کی تعمیر سے پہلے اس علاقہ میں معاش کا تمام تر انحصار جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، یا تو گلہ بانی اور شکار پر تھا یا لوٹ مار پر لیکن اب تجارت کی راہ کھل جانے کی وجہ سے ہر قسم کی اجناس اور پھل اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی فراوانی ہوئی جس سے لوگوں

کی معیشت میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی آگئی۔

دوسرا یہ کہ خانۂ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو وقار و احترام کا ایک ایسا مقام حاصل ہوگیا کہ تمام عرب پر ان کی سیاسی اور مذہبی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ تک برابر جاتے اور کوئی ان سے مزاحمت کی جرأت نہ کرتا۔ بلکہ تاریخوں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ ان کے قافلے جن شاہراہوں سے گزرتے ان پر بسنے والے قبائل ان سے تعرض کرنے کے بجائے اپنے اپنے حدود کے اندر ان کی حفاظت اور رہنمائی کے لئے بدرقہ فراہم کرتے۔ سورۂ لایلاف میں قرآن مجید نے قریش کے انہی تجارتی سفروں کا حوالہ دے کر ان سے مطالبہ کیا ہے فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (پس چاہیئے کہ اس گھر کے رب کی وہ بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرہ سے نچنت کیا) اس لئے کہ فی الواقع یہ اسی گھر کی برکت تھی کہ وہ ایک پُرخطر اور چٹیل بیابان میں امن سے بھی بہرہ مند ہوئے اور ان کے لئے معاش کی راہیں بھی فراخ ہوگئیں۔

بحث کے یہ سارے پہلو تو بالکل واضح ہیں البتہ یہاں ایک بات ایسی ہے جو ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں کھٹکے وہ یہ کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے رزق کے لئے جو دعا کی ہے وہ مخصوص طور پر پھلوں کے رزق کی دعا ہے۔ اپنی اولاد کے لئے رزق و فضل کی دعا کرنا بالخصوص جب کہ وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسائی جا رہی ہو ایک بالکل فطری چیز ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس رزق کے لئے پھلوں کی شرط کیوں لگائی۔ ذوق تو یہ کہتا ہے کہ انہیں رزق کی ایک جامع دعا مانگ کر یہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑنا تھا کہ رزق وہ انہیں کس شکل میں دے، اپنی طرف سے کسی خاص نوعیت کے رزق کی تجویز پیش کرنا ایک پیغمبر کے لئے کچھ موزوں نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید میں دوسرے انبیاء کی یا خود حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دعائیں جو مذکور ہیں ان پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تخصیص و تعیین سے جو ایک تجویز کی سی شکل اختیار کرے ان میں بالعموم احتراز فرمایا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ کھٹک محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ثمرات سے مراد صرف میوہ جات ہیں حالانکہ ثمرات کے معنی صرف میوہ جات کے نہیں آتے بلکہ میوہ جات کے ساتھ ساتھ اجناس اور غلہ جات بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ میوہ جات کے لئے مخصوص لفظ عربی میں فواکہ کا ہے۔ ثمرات کا لفظ اس سے عام اور وسیع ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اسی ابراہیمی دعا کی برکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثمرات کل شیء (ہر چیز کے پھل) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ (۵۷۔ قصص) (کیا ہم نے ایک مامون حرم میں ان کے قدم نہیں جمائے جہاں ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں)

ہم اوپر یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سرزمین جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیلؑ کو بسایا ایک چٹیل اور غیر آباد جگہ تھی۔ تورات میں اس کے لئے بیابان کا لفظ استعمال ہوا ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں اس کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی وادی) سے تعبیر کیا ہے۔ تورات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی بسر اوقات گلہ بانی اور شکار پر تھی جس کے سبب سے انکا زیادہ تر وقت باہر بسر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب معاش کا انحصار گلہ بانی اور شکار پر ہو تو وہ پُرسکون اور برقرار زندگی وجود میں نہیں آسکتی تھی جو بیت اللہ کی تولیت کے فرائض اور اس مشن کی تکمیل کے لئے ضروری تھی جو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے سپرد فرمایا تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لئے یہ دعا کی کہ ان کو بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں اور پریشانیوں کی جگہ حضری زندگی کا سکون و اطمینان نصیب ہو تاکہ وہ توحید اور عبادتِ الٰہی کے اس عالمگیر مرکز کی پوری دلجمعی کے ساتھ خدمت کر سکیں جس کی خدمت پر وہ مامور کئے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا سورۂ ابراہیم میں بھی نقل ہوئی ہے۔ وہاں کچھ الفاظ زیادہ ہیں جن سے وہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي — اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں
بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ — سے بعض کو ایک بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم

الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ	گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب میں
فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ	نے اس لئے بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں پس
تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ	تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور
الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ٥	ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ یہ تیرا شکر
(۳۷ - ابراهیم)	ادا کرتے رہیں۔

اس دعا کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے لئے یہاں اپنے رب سے دو چیزوں کی درخواست کی ہے اور اس درخواست کے حق میں دو چیزوں کو بطورِ سفارش پیش کیا ہے۔ درخواست تو یہ پیش کی ہے کہ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی دے اور اس کے حق میں سفارش یہ پیش کی ہے کہ یہ سرزمین زراعت سے بالکل محروم سرزمین ہے لیکن میں نے اپنی اولاد کو صرف اس لئے یہاں لا ڈالا ہے کہ یہ تیرے محترم گھر کی خدمت کریں اور تیری بندگی کی دعوت کے لئے نماز قائم کریں۔ غور کیجئے کہ جب ثمرات کی روزی کے لئے وہ وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ بن کھیتی کی زمین ہے تو ان کا مدعا ثمرات سے صرف میوہ جات تو نہیں ہو سکتے بلکہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ گلہ بانی اور شکار کی بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں سے چھوٹ کر حضری زندگی کے سکون سے بہرہ مند ہوں کہ تیرے گھر اور تیرے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ آیت کے آخر میں لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ کے جو الفاظ آئے ہیں وہ بھی نہایت معنی خیز ہیں یعنی میں ان کے لئے جو سکون کی زندگی Settled Life کا طالب ہوں تو اس لئے نہیں کہ ان کے لئے سامانِ عیش کی فراوانی چاہتا ہوں بلکہ صرف اس لئے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لئے یکسو رہ کر زیادہ سے زیادہ تیری شکرگزاری کا حق ادا کر سکیں۔

مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ الآیہ۔ حضرت ابراہیمؑ نے رزق کے لئے جو دعا فرمائی اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ اس کے حق دار صرف وہی لوگ ٹھہریں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں۔ یقیناً یہاں یہ پیش بندی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لئے فرمائی کہ اوپر امامت وخلافت کے معاملہ میں ان کو یہ صاف جواب مل گیا تھا کہ اس

عہد کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا جو شرک وکفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ بات سامنے تھی اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر قیاس کر کے یہاں اپنی دعا میں از خود یہ قید لگا دی کہ میں یہ درخواست صرف اہلِ ایمان کے لئے کر رہا ہوں۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مرتبہ تسلیم ورضا کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ فائز تھے۔ اشارہ بھی اگر مل گیا ہے کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو جھپٹ کر ادھر کو چل پڑے ہیں اگرچہ اس اشارہ کا مطلب بعد میں کچھ اور ہی واضح ہوا ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ امامت وخلافت اور معیشتِ دنیا کے معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کے نافرمان ہیں وہ خدا کی خلافت کے سزاوار تو ہرگز نہیں ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی نافرمانی کے سبب سے خدا ان کی روزی بھی چھین لے۔ روزی اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور فرمانبرداروں دونوں کو اس حیاتِ چند روزہ میں دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس زندگی میں جو لوگ اس کے رزق سے نافرمانی کرتے ہوئے متمتع ہوتے ہیں ان کو مرنے کے بعد وہ دوزخ میں جھونک دے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بڑی وضاحت کے ساتھ آگے مختلف سورتوں میں بیان ہوگی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی معرکۃ الآراء تصنیف

تزکیہ نفس

یا

اسلامی تصوف

اسلام کا مطلوب تزکیہ علم وعمل سمجھنے کے لئے اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

قیمت: قسم اول ——— چھ روپے قسم دوم ——— چار روپے پچاس پیسے

قسم سوم ——— تین روپے پچھتر پیسے (محصول ڈاک علاوہ)

ملنے کا پتہ:- مکتبہ "میثاق" رحمان پورہ - اچھرہ - لاہور - ۱۲

مطالعہ حدیث

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

مشکلہ معہ

(۳)

اپریل کے شمارے میں قرآنی مضامین کے لحاظ سے حدیث کی تین اقسام نظائر و شواہد کے ساتھ بیان کی گئی تھیں۔ اس شمارے میں حدیث کی چوتھی قسم مع امثلہ و شواہد پیش کی جا رہی ہے (ش - غ - ع)

مخالفِ قرآن روایات مضمون کے لحاظ سے حدیث کی چوتھی قسم ایسی احادیث پر مشتمل ہے جو قرآنی آیات سے متصادم ہیں۔

واضح رہے کہ یہ تصادم و تعارض صرف ظاہر نظر میں ہے، جو معمولی غور و تامل سے رفع ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے اختلاف کو حقیقی تعارض نہیں قرار دیا جا سکتا۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں۔

نحن نقول قولا كليا نشهد الله وملائكته، انه ليس في حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يخالف القرآن ولا ما يخالف العقل الصريح بل كلامه بيان للقرآن وتفسير له وتفصيل لما

ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کو گواہ ٹھہراتے ہوئے (بغیر کسی استثناء کے) کلی اور عمومی طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو قرآن کے مخالف ہو یا عقل صریح سے ٹکراتی ہو بلکہ آپ کے ارشادات قرآنی آیات کے بیان و

اجمله وكل حديث من رده بزعمه انه يخالف القرآن فهو مطابق للقرآن وغايته ان يكون زائدا على ما في القرآن وهذا الذي امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقبوله (الصواعق المرسلة ج ۲ ص ۲۴۱)

تفسیر ہیں اور قرآنی اجمال کی تفصیل و توضیح ہیں، ہر وہ حدیث جس کو یہ خیال کرتے ہوئے رد کیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے مخالف ہے (واقعہ یہ ہے کہ) وہ قرآن کے مطابق ہے انتہائی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی روایات قرآن سے زائد مضمون پیش کرتی ہیں (لیکن واضح رہے کہ) ایسی روایات کے قبول کرنے کا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔

امثال و نظائر حدیث کی زیر بحث قسم کی وضاحت کے لئے چند نظائر و شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فہم حدیث کے لئے کس قسم کی دیدہ وری کی ضرورت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ

بے شک میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی بنا پر عذاب دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر شخص کے مرنے کے بعد اس پر ماتم کیا جائے، نوحہ اور سینہ کوبی جیسے اعمال کا مظاہرہ ہو تو مردے کو اس کے رشتہ داروں کے ان اعمال کی بنا پر عذاب کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ اس حدیث کا ظاہری مفہوم قرآن مجید کی آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) سے متصادم ہے۔

امام بخاریؒ نے اس اشکال کو اس طرح رفع کیا ہے۔

اذا كان النوح من سنته لقوله تعالى قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا، وقال

میت کو گھر والوں کے ماتم کی بنا پر عذاب اس صورت میں ہوگا، جب کہ یہ نوحہ و ماتم خود اس کا طریق کار رہا ہو، کیونکہ قرآن میں ارشاد

النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ فاذا لم یکن من سنتہ فھو کما قالت عائشۃؓ لا تزر وازرۃ وزر اخری، و ھو کقولہ وان تدع مثقلۃ (ذنوبا) الی حملھا لا یحمل منہ شئ

(صحیح بخاری مصری ج ۱ ص ۲۲۳)

ہے: اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اسی طرح ارشاد نبوی ہے تم میں سے ہر ایک راعی اور نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں باز پرس ہوگی، لیکن اگر اس کا یہ طرز عمل زندگی میں نہیں تھا تو اس شکل میں حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق آیت "لا تزر وازرۃ" اس پر چسپاں ہوگی یعنی اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی (اسی طرح) دوسری آیت میں ہے: اگر کوئی گناہوں سے بوجھل شخص کسی دوسرے کو اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے بلائے گا تو اس کا بوجھ اٹھایا نہ جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اسی قسم کا طرز عمل اختیار کرتا ہے یا اس قسم کے منکرات پر وہ نفرت و بیزاری کا اظہار نہیں کرتا یا مرتے وقت سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کی وصیت کر جاتا ہے تو ان سب صورتوں میں مذکورہ بالا حدیث کے مطابق وہ عذاب کا سزاوار ہوگا۔

دورِ جاہلیت میں اس نوع کی وصیت کرنے کا عام رواج تھا جیسا کہ طرفہ بن العبد اپنی بھتیجی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

فَاِنْ مِتُّ فَانْعِیْنِیْ بِمَا اَنَا اَھْلُہٗ
وَشُقِّیْ عَلَیَّ الْجَیْبَ یَا ابْنَۃَ مَعْبَدٍ

یعنی اگر میں مرجاؤں تو میری موت کی خبر ایسی مدح سرائی کے ساتھ نشر کرنا۔ جس کا واقعی میں مستحق ہوں۔ اور اے بھائی معبد کی بیٹی! میرے مرنے پر اپنا گریبان چاک کرنا۔

اس کے برعکس اگر مرنے والا اس قسم کے رسم و رواج سے روکتا رہا ہے یا کم سے کم

اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہا ہے تو خدا کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔

جمہور اہل علم نے یہی توجیہ اختیار کی ہے، یعنی مذکورہ بالا قرآنی ضابطے کے مطابق زیر غور حدیث کا عموم اپنی جگہ قائم نہ رہا۔

یہ ایسی معقول توجیہ ہے جس کی بنا پر نہ قرآنی آیت کی تاویل کرنی پڑی اور نہ حدیث کو رد کرنے کی نوبت آئی۔

حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سہو و نسیان اور خطاء فہم پر محمول کیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ اصل بات یہ تھی کہ .....

انما مر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی یھودیۃ یبکی علیھا اھلھا فقال انھم لیبکون علیھا وانھا تعذب فی قبرھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک بار ایسی یہودیہ کی قبر کے پاس سے ہوا جس کے گھر والے اس پر ماتم کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ لوگ اس پر ماتم کر رہے ہیں، حالانکہ وہ اپنی قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس یہودیہ کے رشتہ دار تو اس کی مدح و تعریف میں مشغول ہیں اور اس کے فراق میں نالہ و شیون بپا کیا ہوا ہے حالانکہ وہ اپنی بداعمالیوں کی بنا پر عذاب کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ یہاں نوحہ خوانی اور میت کے عذاب پانے کے درمیان علت و معلول کا تعلق نہیں ہے بلکہ دونوں امور اپنی اپنی جگہ الگ الگ ہیں۔

صحیح مسلم کی روایت میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں

قالت عائشۃ یغفر اللہ لابی عبد الرحمن اما انہ لم یکذب ولکنہ، نسی او اخطأ۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن (عبداللہ ابن عمرؓ) کو معاف فرمائے اصل بات یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولے ہاں ان سے بھول چوک اور خطا ہوگئی ہے۔

حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کے بعض الفاظ میں راوی کا وہم بتاتے ہوئے حدیث کا ایسا منظر بیان کیا ہے کہ جس کی بنا پر قرآن و حدیث کے درمیان تعارض کا کوئی احتمال ہی

باقی نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ حدیث صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی سے مروی نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ دوسرے متعدد صحابہ بھی اس حدیث کے راوی ہیں (ملاحظہ ہو سبل السلام ج ۲ ص ۱۵۳) اس لئے وہم راوی قرار دینے کے بجائے جمہور اہل علم کی توجیہہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

امام قرطبیؒ نے تعارض کو رفع کرنے کے لئے ایک دوسرا نکتہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآنی آیت "لاتزر وازرۃ" کا تعلق آخرت سے ہے یعنی قیامت کے دن کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ باقی رہی مذکورہ بالا حدیث تو اس کا تعلق برزخی حالات سے ہے جو ایک گونہ دنیاوی احوال کے مشابہ ہیں۔ دنیاوی عذاب کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (اور اس فتنہ سے بچو جس کا نشانہ صرف ظالم لوگ ہی نہیں بنیں گے، بلکہ اس کی لپیٹ میں غیر ظالم بھی آ جائیں گے)

اگر غور کیا جائے تو نتیجے کے لحاظ سے جمہور اہل علم کی توجیہہ اور اس نکتہ میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محدثین کرام نے قرآن و حدیث کے باہمی تعلق کو کیسے حکیمانہ اسلوب سے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے جزاھم اللہ عنا خیر الجزاء۔

اس صورتِ حال کی وضاحت کے لئے قرآن کی مندرجہ ذیل دو آیتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ مشرکین کے بارے میں سورۃ نساء آیت ۴۲ میں فرمایا گیا ہے۔ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا یعنی مشرکین قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ مشرکین کہیں گے وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (سورہ انعام۔ ۲۳) یعنی قسم ہے ہمارے رب کی ہم مشرک نہ تھے۔

بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے لیکن حضرت ابن عباسؓ نے اس کی توجیہہ یہ کی

ہے کہ مشرکین قیامت کے ابتدائی مرحلے میں تو اپنے شرک کا انکار ہی کریں گے لیکن جب منہ پر مہر لگ جائے گی اور اعضاء گواہی دیں گے تو پھر مشرکین کوئی بات اپنے رب سے مخفی نہ رکھ سکیں گے۔

جس طرح ان دونوں آیات کو مختلف حالات پر محمول کیا گیا ہے اسی طرح زیر بحث آیت اور حدیث کے دو محمل الگ الگ مانے جا سکتے ہیں۔

۲۔ قرآن سے متعارض ہونے کی دوسری نمایاں مثال صحیح بخاری کی وہ حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ کذب ابراھیم علیہ السلام ثلث کذبات۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے تین مواقع پر کذب بیانی سے کام لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث قرآنی آیت وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا سے متصادم ہے کیونکہ قرآن تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انتہائی راست باز نبی قرار دیتا ہے لیکن حدیث سے ان کے تین جھوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ روایت ناقابلِ قبول ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کچھ غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ تعارض و اختلاف رفع ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

الکلام له نسبتان، نسبة الی المتکلم وقصده وارادته ونسبة الی السامع وافهام المتکلم ایاه مضمونه فاذا اخبر المتکلم بخبر مطابق للواقع وقصد افهام المخاطب ایاه، صدق بالنسبتین فان المتکلم ان قصد الواقع وقصد افهام المخاطب فهو

کلام و گفتگو کی دو نسبتیں یا حیثیتیں ہوتی ہیں (۱) متکلم کے قصد و ارادے کے لحاظ سے (۲) سامع کے اعتبار سے، یعنی متکلم سامع کے ذہن میں کیا بات اتارنا چاہتا ہے ان دو نسبتوں کے لحاظ سے کلام کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) متکلم اصل واقعہ کے مطابق خبر دے اور اس کی نیت بھی یہی ہو کہ صحیح صورتِ حال سے مخاطب آگاہ ہو جائے

صدق من الجهتين وان قصد
خلاف الواقع وقصد مع ذلك
افهام المخاطب خلاف ما ما قصد
بل معنى ثالثا لا هو الواقع
ولا هو المراد فهو كذب
من الجهتين بالنسبتين معًا
وان قصد معنى مطابقًا صحيحًا و
قصد مع ذلك التعمية على المخاطب
وافهامه خلاف ما قصده
فهو صادق بالنسبة الى قصده،
كذب بالنسبة الى افهامه
ومن هٰذا الباب التورية
والمعاريض، وبهذا اطلق
عليها ابراهيم الخليل
صلى الله عليه وسلم اسم الكذب
مع انه الصادق فى خبره
ولم يخبر الا صدقا فتامل
هذا الموضع الذى اشكل
على الناس وقد ظهر بهذا
ان الكذب لا يكون قط
الا قبيحا، وان الذى
يحسن ويجب انما هو التورية
وهى صدق۔

یہ صورت مذکورہ بالا دونوں نسبتوں کے اعتبار سے صدق پر مشتمل ہوگی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ خلاف واقعہ خبر دی جائے اور جو متکلم کا مقصود ہے وہ بھی مخاطب پر ظاہر نہ ہونے دیا جائے بلکہ کوئی تیسرا مفہوم مخاطب کے ذہن میں اتارنے کی کوشش کی جائے جو نہ واقع کے مطابق ہو اور نہ متکلم کا مطمح نظر ہو اس صورت کو دونوں نسبتوں کے لحاظ سے کذب (جھوٹ) مانا جائے گا۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ متکلم کے پیش نظر واقع کے مطابق صحیح خبر دینا ہی مقصود ہوتا ہے لیکن گفتگو کا اسلوب ایسا اختیار کرتا ہے کہ مخاطب کا ذہن متکلم کے اصل مقصد کو سمجھنے کے بجائے ایسے امر کی طرف منتقل ہو جائے جو متکلم کا منشا نہیں ہے۔

یہ صورت اصل واقعہ کے لحاظ سے صدق ہے، لیکن مخاطب کے فہم کے اعتبار سے اس پر کذب کا اطلاق ہو سکتا ہے اس قسم کے اسلوب کلام کو توریہ اور تعریض کہا جاتا ہے۔

اسی پہلو کے پیش نظر حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کذب کا اطلاق کیا ہے ورنہ اصل واقعہ

وقد يطلق عليه الكذب
بالنسبة الى الافهام لا الى
العناية (مفتاح دار السعادة
ومنشور العلم والارادة
ج ۲ ص ۳۹)

کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ اس گفتگو میں سچے ہیں۔

حدیث کی اس تشریح و توضیح پر انتہائی غور و فکر کی ضرورت ہے یہ مقام بہت سے لوگوں کے ذہنی الجھن کا باعث بن گیا ہے۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ

کذب بہرحال قبیح ہوگا، ہاں کوئی امر اگر (بوقت ضرورت) پسندیدہ یا لازم ہو سکتا ہے تو وہ توریہ و تعریض ہو سکتا ہے (نہ کہ حقیقی کذب) یہ توریہ اصل واقعہ کے لحاظ سے صدق پر مشتمل ہوتا ہے، ہاں اس پر کذب کا اطلاق اس اعتبار سے کر دیا جاتا ہے کہ واقعہ کے مطابق اصل مقصود مخاطب کو باور کرانا مطلوب نہیں ہوتا۔

سردست ان دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی صحیح السند حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ اگر کہیں قرآنی آیت اور حدیث کے درمیان بظاہر تعارض محسوس بھی ہوتا ہے تو معمولی غور و فکر سے اس کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے قرآنی آیات کے باہمی تعارض و اختلاف کو بآسانی دور کیا جا سکتا ہے۔ حدیث کو پرکھنے کا ایک معیار عقل بھی شمار کی جاتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کس کی عقل؟ اگر عقل سے مراد وہ عقل ہے جو روسی اشتراکیت، فرنگی تہذیب یا امریکی ثقافت سے مرعوب ہو تو حدیث کی کیا بساط ہے خود قرآن بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا اور اگر عقل سے مراد عقل سلیم ہے جو قلب منیب کی نگرانی میں ہو تو اس شکل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ کوئی حدیث بھی خلاف عقل نہیں پیش کی جا سکتی۔

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

اسلام اور انسانی حقوق

(۲)

اسلام جس طرح ہر شخص کی جان، مال اور عزت و آبرو کو قابلِ احترام قرار دیتا ہے اسی طرح وہ ہر شخص کو آزادی اور اختیار کی نعمت سے بھی نوازتا ہے۔ چنانچہ فکر و خیال، عقیدہ و مسلک، قول و عمل اور رائے و اجتہاد میں ہر شخص آزاد ہے۔ اسی طرح مال و دولت اور اسباب و جائداد میں ہر فرد کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ اپنے مال و جائداد میں جس طرح کا تصرف چاہے کرے۔ اس سلسلہ میں اولاً تو اسلام کوئی پابندی عائد نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو اس کی ٹھیک وہی نوعیت ہوتی ہے جیسے کوئی مخلص اور ناصح طبیب مریض کو مضر اشیاء کے استعمال سے یا کوئی شفیق اور مہربان باپ اپنے بچے کو آگ میں ہاتھ ڈالنے یا بری عادتوں اور غلط حرکتوں سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے اگر اسلام میں کچھ پابندیاں نظر آتی ہیں تو اولاً تو وہ نامناسب نہیں ہیں دوسرے ان کا مقصد نہ تو کسی کی آزادی و اختیار میں رکاوٹ ڈالنا ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اس کی ملکیت سے دستبردار کرنا۔ ذیل میں ان مراعات اور حقوق کی تفصیل بیان کی جاتی ہے جو اسلام نے ہر فرد کو عطا کئے ہیں۔

آزادیٔ فکر

اسلام عقل و فطرت کا دین ہے۔ اس کی بنیاد جہالت کے بجائے علم و بصیرت پر ہے اور یہ اس کا بڑا احسان اور اہم خصوصیت ہے کہ وہ ہر شخص کو سوچنے سمجھنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ خدا نے ہر شخص کو آنکھیں اس لئے دی ہیں

کہ وہ ان سے دیکھے، کان اس لئے دیئے ہیں کہ وہ خود ان سے سنے اور دل و دماغ اس لئے عطا کیا ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کی سمجھ پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنی عقل سے کام لے۔

اسلام نہ صرف سوچنے سمجھنے کی پوری آزادی دیتا ہے بلکہ بار بار فکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے تاکہ آدمی حق و ناحق، صحیح و غلط اور خیر و شر میں پورے شعور اور بصیرت کے ساتھ تمیز کرے اور یہ واقعہ ہے کہ جب آدمی بلا سوچے بوجھے محض دوسروں کو دیکھ کر کوئی طریقہ اختیار کر لیتا ہے تو اس میں کبھی پختگی اور استحکام نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ خود اس پر اچھی طرح مطمئن ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام کسی بات کو بغیر حجت و دلیل کے ماننے پر مجبور نہیں کرتا یہاں تک کہ دینِ برحق کو بھی زبردستی اختیار اور قبول کرنے کی دعوت نہیں دیتا۔ اس کے برعکس وہ آدمی کی عقل، فیصلہ، تجربہ اور بصیرت سے اپیل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دینِ حق کو اختیار کیا جائے تو سوچ اور سمجھ کر اور پورے شعور اور ادراک کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ اس کا صاف اعلان یہ ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرہ ۲۵۶)　دین کے قبول و اختیار میں کوئی جبر نہیں، ہدایت خود گمراہی سے نمایاں اور واضح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فطری طور پر اس کی خواہش تھی کہ سارے لوگ خدا پرستی کا رویہ اختیار کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آنحضور کو بتایا کہ یہ ممکن نہیں کہ سب لوگ تمہاری بات مان لیں۔ اور اگر نہیں مانتے تو اس میں تمہارا کیا بگڑتا ہے جو تم اس قدر پریشان ہوتے ہو کسی کے ساتھ زبردستی تو نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس ۹۹)　کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ ایمان لائیں۔

دین فطرت کے مطابق ہے

یہی وجہ ہے کہ دین و شریعت کے تمام مسائل عقل و فطرت کے عین مطابق بنائے گئے ہیں تاکہ آدمی اگر واقعی اپنی عقل اور سمجھ سے کام لے تو بھی اسے غلطی نہ ہو۔ علماء اسلام نے اپنی کتابوں میں اسلامی احکام و شرائع

کی حکمتوں اور مصلحتوں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیم (رحمہما اللہ) نے اپنی تصنیفات میں یہ ثابت کیا ہے کہ شریعت اور دین کا کوئی حکم بھی خلافِ عقل و قیاس نہیں اور جن مسائل کو خلاف قیاس سمجھا اور بتایا جاتا ہے ان کی دو وجہیں ہیں یا تو قیاس ہی فاسد ہوتا ہے یا وہ حکم نص و صریح سے ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں شریعت کے جزئیات تک کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خالی از حکمت و مصلحت نہیں، اسی لئے شروع ہی سے صحابہ کرامؓ میں بھی ایک گروہ ایسا رہا ہے جو ہر معاملہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احکام شریعت کے اسباب و مصالح معلوم کرتا تھا اور ان میں بحث و تدقیق کا عادی تھا، اور جو باتیں خلاف عقل معلوم ہوتی تھیں ان کو ماننے میں اسے تامل ہوتا تھا۔ جن علماء سلف کو اس معاملہ میں محتاط سمجھا جاتا ہے اور وہ جو مسائل کی بحث و تفتیش میں نہیں پڑتے تو ان کا بھی یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ دین کو عقل و فطرت کے مطابق نہیں سمجھتے بلکہ وہ انسانی عقل کو اس قدر محدود اور ناقص بتاتے ہیں کہ حکمتِ ربانی کا فہم و ادراک اس کے بس سے باہر سمجھتے ہیں ان کی یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کیونکہ آج کل کی بعض جدت پسند طبیعتیں جو صحیح فکر و استدلال سے ناآشنا ہوتی ہیں، ہر معاملہ کے متعلق فوراً ہی خلافِ عقل ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتی ہیں۔ حالانکہ وہ در اصل خلاف عقل نہیں ہوتے بلکہ یہ ان حضرات کی ظاہر بینی اور فتورِ عقل ہے جو انہیں ہر بات کو خلافِ عقل کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

قرآن اور دعوتِ فکر و نظر

یہ ایک ضمنی بحث تھی، اصل گفتگو یہ تھی کہ اسلام انسان کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ قرآن مجید کا کوئی ورق بھی دعوتِ فکر و نظر سے خالی نہیں، وہ بار بار انسانی ذہن و دماغ کو غور و خوض کی تلقین کرتا ہے، قیاس و استنباط سے مسلمات اور نتائج اخذ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ توحید، رسالت اور جزاء و سزا جیسے مسلمات اور حقائق بھی بربنائے بصیرت تسلیم کرانا چاہتا ہے، آسمان و زمین اور ان کے مابین کی چیزوں کی تخلیق خدا کی قدرت و حکمت کے عام آثار و مظاہر اور خود اس کے وجود و خلقت کے اندر غور و فکر کرنے کی اہمیت بیان

کرتا ہے تاکہ اس کی عقل و بصیرت اسے اصل حقیقت اور صحیح نتیجہ تک پہنچا دے۔ اس طرح کی آیات بے شمار ہیں جن میں انسان کو اس نوعیت سے غور و فکر کرنے اور عقل و دانائی سے کام لینے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ (روم ۸)

کیا یہ لوگ اپنے تئیں سوچتے نہیں کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصد کے ساتھ اور ایک مقرر مدت تک کے لئے پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ اپنے رب سے ملنے کا انکار کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (یونس ۱۰۱)

کہہ دو کہ ذرا دیکھو تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

دوسری جگہ آسمان و زمین کی حکمرانی اور نظام پر غور کرنے کے لئے کہا گیا۔

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (اعراف ۱۸۴)

کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کی بادشاہی میں غور نہیں کرتے۔

انسان کی جس حقیر نطفہ سے پیدائش ہوئی ہے اس پر غور کرنے کے لئے کہا گیا ہے، تاکہ وہ قیامت اور بعث بعد الموت کا انکار نہ کر سکے۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ (طارق ۴، ۵)

انسان کو غور کرنا چاہیئے کہ کس چیز سے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے۔

آفاق و انفس میں غور کرنے کی اہمیت بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کو ملامت کی جاتی ہے جو نظر و بصیرت سے کام نہ لینے کی وجہ سے جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (ذاریات ۲۰-۲۱)

زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود تمہارے اندر بھی کیا تمہیں سجھائی نہیں دیتا؟

قرآن مجید اپنی آیات میں غور و فکر کی تلقین کرتا ہے اور جو لوگ غور و فکر نہیں کرتے انہیں نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ کرتا ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد ۲۴)
کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں قصّے اور مثالیں بھی اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ لوگ غور و فکر سے کام لے کر درست حقائق تک پہنچ جائیں اور عبرت و تذکر حاصل کریں۔

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (حشر ۲۱)
یہ مثالیں ہم لوگوں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔

سورۂ اعراف میں ہے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اعراف ۱۷۶)
واقعات بیان کرو تاکہ لوگ فکر سے کام لیں۔

اقوام و ملل کی حکایت اور امم معذبہ کی داستانِ ہلاکت و بربادی کے ذکر کا مقصد بھی تنبیہ، تذکیر اور لوگوں کو آمادۂ غور و فکر کرنا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (یوسف ۷)
یوسف اور ان کے بھائی (کی حکایت) میں پوچھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

سورۂ یوسف کے آخر میں پوری حکایت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (یوسف ۱۱۱)
ان کے قصوں میں عقل مندوں کے لئے عبرت کا سامان ہے۔

اسی طرح متعدد واقعات اور قصّوں کے ذکر کے بعد اس طرح آیتیں بیان کی ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ (حجر ۷۵)
بلاشبہ اس میں تاڑ جانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

کہیں فرمایا:۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (ق ۳۷)
بلاشبہ اس میں اس کے لئے یاددہانی اور نصیحت ہے جس کے پاس قلب ہو اور وہ کان لگا کر پوری توجہ سے سنتا ہو۔

غرضیکہ اس طرح کی آیات جن میں انسان کو فکر و نظر اور غور و استدلال کی دعوت دی گئی ہے اور فقہ و بصیرت سے کام نہ لینے والوں کو ملامت کی گئی ہے اس کثرت سے ہیں کہ ان کا استقصار دشوار ہے۔ بے شمار آیات کی ابتداء اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا، اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا، اَوَلَمْ یَرَوْا اور اختتام ان فی ذلک لعبرة، لتذکرة، لذکری، لذکرا، لاٰیۃ، لاٰیات لقوم یتفکرون، یوقنون، یعلمون، افلا تتفکرون، افلا تنظرون وغیرہ الفاظ و کلمات پر ہوتا ہے جس کا منشاء انسان کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ اور غور و فکر، نظر و تدبر کی تلقین، حکمت و دانائی اور ہوش و حواس سے کام لینے کی ترغیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو انسانی ذہن و فکر کی آزادی کا کس قدر خیال ہے۔

(باقی)

(بقیہ از صفحہ ۲۷)

کمزوریوں کا پورا پورا لحاظ ہے، اس میں تدریج اور تربیت کا اہتمام ہے۔ یہ انکشاف ان لوگوں کے لئے بڑی قیمتی دولت ہے جو شریعت کے اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں اور اس کے اصل فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی انکشاف سے ان کے لئے حکمت کی راہیں کھلتی ہیں اور معرفت کی راہ میں ان کے قدم مضبوط ہوتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی
تفسیر تدبر قرآن
(تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ)
جس کے مطالعے سے
• قرآن مجید میں غور و فکر کا شوق پیدا ہوتا ہے • آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ کی حقیقت و اہمیت واضح ہوتی ہے اور • قرآن فہمی کی راہیں کھلتی ہیں قیمت: ۵۰ پیسے (علاوہ محصول ڈاک)
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ میثاق رحمان پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور۔ ۱۲

مراسلہ ومذاکرہ

امین احسن اصلاحی

نسخ سے متعلق دو سوال

میثاق کے گزشتہ شمارے میں تفسیر سورۂ بقرہ کے تحت نسخ کی جو بحث شائع ہوئی ہے اس کو پڑھ کر ایک قاری کے ذہن میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ اگر مختلف ادیان یا شرائع کے ذریعہ انسانی ذہن کی تربیت کی جاتی رہی ہے اور انبیائے کرام خوب سے خوب تر دین پیش کرتے چلے آتے ہیں تو آخر یہ سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر کیوں ختم ہو گیا ہے، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اس کے بعد بھی بدستور ترقی کے مدارج طے کرتا چلا جاتا ہے۔ آخر یہ کیسے فرض کر لیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انسانی ذہن جس معیار تک پہنچ گیا ہے اس کے بعد وہ اس سے اوپر نہیں سوچ سکتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ منسوخ آیات کو باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے جب کہ وقتی یا ہنگامی قسم کے احکام وحی خفی کے ذریعہ سے دیئے جا سکتے تھے اور غیر متبدل احکام قرآن مجید میں رکھے جا سکتے تھے۔

امید ہے ان دونوں سوالوں کے مفصل جواب مرحمت فرمائیں گے۔

جواب نمبر

۱۔ آپ کے پہلے سوال کا جواب میں نے اپنی کتاب "اسلامی قانون کی بنیادیں" میں دیا ہے اس کی تمام قسطیں میثاق کی پچھلی اشاعتوں میں نکل چکی ہیں۔ اگر آپ اس میں سے اسلامی قانون کے ارتقاء کی فصل پڑھ لیتے تو مجھے توقع ہے کہ آپ کا شبہ صاف ہو جاتا۔ ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا اگرچہ طبیعت پر گراں سا گزر رہا ہے لیکن آپ کی الجھن دور کرنے کے لئے مختصراً پھر

عرض کرتا ہوں۔ اس مسئلہ سے متعلق دو باتیں نگاہ میں رکھیے۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں ہر چیز کی ترقی کی ایک خاص حد ہے جس پر پہنچ کر وہ اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہاں کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ترقی و عروج کی غیر محدود صلاحیتیں رکھتی ہو۔ شجر و حجر سے لے کر انسان تک اور ذرہ سے لے کر مہر و ماہ تک جتنی بھی مخلوقات ہیں سب محدود اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر فانی ہیں۔ غیر محدود اور ابدی و ازلی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ افراد بحیثیت افراد کے، قومیں بحیثیت اقوام کے اور یہ کائنات بحیثیت مجموعی سب ایک ہی قانون کے تابع ہیں۔ سب کے عروج و کمال کی ایک خاص حد ہے اور پھر بالآخر سب کے لئے زوال اور فنا ہے۔ اگر ہم انسان کی ترقی کو غیر محدود مان لیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم نے اس کو خدا مان لیا اور اگر ہم اس دنیا کی ترقی کو غیر محدود مان لیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ ایمان باللہ کے بھی منافی ہے اور ایمان بالآخرت کے بھی۔ اس وجہ سے یہ خیال تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ انسان اس دنیائے فانی میں غیر محدود صلاحیتوں کا مالک ہے۔ جس طرح افراد کو آپ دیکھتے ہیں کہ بچپن کے دور کے بعد ان پر ایک دور بلوغ اور سنِ رشد کا آتا ہے جس میں وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے حقوق و فرائض پہچان سکیں اور اس حیاتِ دنیوی سے متعلق اپنی ذمہ داریاں کو سمجھ سکیں اسی طرح انسان پر بحیثیت مجموعی بھی بلوغ اور سنِ رشد کا ایک دور آیا جب وہ اس شریعت کا حامل ہو سکا جو تمام بنی نوع انسان کے لئے یکساں اور رہتی دنیا تک اس کی رہنمائی کے لئے کفایت کرنے والی ہے۔ ہمارے نزدیک انسانیت کے سنِ رشد کا یہی دور ہے جس میں اسلامی شریعت نازل ہوئی چنانچہ اس کے نزول کے بعد دین کی تکمیل کا بھی اعلان کر دیا گیا اور سلسلہ نبوت کے خاتمہ کا بھی۔ اب اگر کوئی شخص ہمارے اس عقیدہ سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ وہ یہ دعوے کرتا ہے کہ انسان کے عروج و ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہے گا اس کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں، ہم جس دور کو انسانیت کا سنِ رشد قرار دیتے ہیں وہ اس کو بھی دورِ طفولیت قرار دیتا ہے تو اس کے اور ہمارے عقائد میں بنیادی اختلاف ہے، وہ درحقیقت انسان اور کائنات کو غیر فانی مانتا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو وہ خود انسان کو خدا مانتا ہے۔ یہ

نزدیک یہ چیز حاشا کفر و شرک ہے۔ اگر ہم اس نظریہ کو تسلیم کریں تو ہمیں اس تصور سے لازماً دستبردار ہونا پڑے گا جو اس کائنات اور اس کے اندر بسنے والے انسان سے متعلق قرآن نے ہمیں دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شریعت الٰہی کی تکمیل ہوگئی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بس اس کے بعد اب شریعت کی ترقی رک گئی، اب نہ انسان کوئی نئی بات سوچے گا اور نہ کسی معاملہ میں شریعت کی رہنمائی کا محتاج ہوگا بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے اس دنیا میں جو اصول ضروری تھے وہ اصول اللہ تعالےٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے انسان کو دیدیئے۔ یہ اصول اس بات کے لئے کافی ہیں کہ رہتی دنیا تک انسان تمام پیش آنے والے معاملات میں ان کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لئے ایک کسوٹی کے طور پر استعمال کر سکے۔ اصولوں کے متعلق یہ بات آپ جانتے ہوں گے کہ جزئیات کی طرح وہ معین حالات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے بلکہ ایک اصول سے ہزاروں لاکھوں جزئیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اصول و کلیات سے جزئیات مستنبط کرنے کے کام کو اسلامی شریعت میں اجتہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس اجتہاد کا کام یہ ہے کہ زندگی میں جتنے مسائل بھی پیدا ہوں ان سب کو اسلامی شریعت کے اصولوں اور اس کے مزاج پر پرکھ کر یہ حکم لگائے کہ ان میں سے کون سی بات اسلام کے مزاج سے موافق ہے اور کون سی ناموافق۔ ہمارے ہاں فقہ کا سارا ذخیرہ اسی اجتہاد کی بدولت ظہور میں آیا ہے اور یہ سارا ذخیرہ انہی مسائل سے متعلق ہے جو انسان نے نئے سوچے اور پیدا کئے ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی جو مسائل پیدا ہوں گے ان کے حل کے لئے یہ اجتہاد کفایت کرے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اس اصول سے کام نہ لیں یا غلط کام لیں۔ ان دونوں باتوں میں سے کسی بات کی بھی ذمہ داری اسلام پر نہیں عائد ہوتی بلکہ خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔

۲- آپ کے دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ منسوخ احکام کے قرآن مجید میں باقی رکھنے میں بہت سی مصلحتیں ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی محفوظیت کے نقطۂ نظر سے ان کا قرآن مجید میں باقی رکھا جانا

ضروری تھا۔ اگر یہ نکال دیئے جاتے تو بہرحال ان کے نکالے جانے کی روایت لوگوں میں باقی رہتی کہ فلاں فلاں احکام قرآن میں تھے جو منسوخ ہو جانے کے سبب نکال دیئے گئے۔ یہ روایات معلوم نہیں کن کن شکلوں میں اگلوں سے پچھلوں کی طرف منتقل ہوتیں اور پھر معلوم نہیں مخالفینِ اسلام ان کو قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ ثابت کرنے کے لئے کس کس طرح استعمال کرتے۔ ان کے باقی رکھے جانے کی وجہ سے یہ کہنے کا کسی کے لئے موقع باقی نہیں رہا کہ قرآن کا کوئی ایک نقطہ یا شوشہ بھی کم و بیش ہوا ہے بلکہ ہم بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعوےٰ کرنے کی پوزیشن میں ہیں کہ قرآن کی وہ آیات بھی قرآن میں بعینہٖ محفوظ ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں۔

دوسری مصلحت اس میں یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہوئے ہیں ان میں سے سب پورے کے پورے منسوخ نہیں ہوگئے ہیں بلکہ بیشتر ایسے ہیں جن میں نسخ کی نوعیت صرف ترمیم کی ہے۔ مثلاً وصیت کا حکم آیاتِ میراث کے ذریعہ سے وارثوں کے لئے تو منسوخ ہوگیا لیکن غیر وارثوں کے لئے اس کی اجازت ثلث مال کے حد تک باقی رہی۔ اسی طرح روزے کے معاملہ میں اصل حکم تو باقی رہا لیکن بعض رعایات منسوخ ہوگئیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض احکام کا وجوب تو منسوخ ہوگیا لیکن ایک نفل نیکی کی حیثیت سے اب بھی وہ قائم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے احکام کا باقی رکھا جانا ضروری تھا۔ اگر ناسخ اور منسوخ دونوں باقی نہ رکھے جاتے تو اصل اور ترمیم میں امتیاز کس طرح ہوتا۔

تیسری یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی اس رافت و رحمت کا ہمیں علم ہوتا ہے جو اس نے اس شریعت کے دینے میں ہمارے لئے ملحوظ رکھی ہے۔ بالخصوص وہ احکام جو است پر مخصوص حالات میں واجب ہوئے لیکن پھر ہمارے ضعف پر نگاہ کرکے ان میں تخفیف کر دی گئی اس رافت و رحمت کا خاص مظہر ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری شریعت اس قسم کے اصر و اغلال سے بالکل پاک ہے جس قسم کے اصر و اغلال یہود کی شریعت میں موجود ہیں۔

چوتھی مصلحت اس میں یہ ہے کہ ان منسوخات سے اسلامی شریعت کا اصل مزاج نمایاں ہوتا ہے کہ اس کی ہر بات میں حکمت و مصلحت ہے، اس میں بندوں کی ضروریات اور ان کی

(باقی بر صفحہ ۴۳)

اقتباسات و تراجم

جناب خالد مسعود صاحب

حقیقت شناس ذہن کی منزل

(یہ مضمون البعث الاسلامی لکھنؤ کے ایک حالیہ شمارہ میں سے ترجمہ کیا گیا ہے)

حاتم اصم حضرت شقیق بلخی رحمہ اللہ تعالےٰ کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ استاد نے شاگرد سے پوچھا "تمہیں میرے ساتھ رہتے ہوئے کتنی مدت ہوگئی ہے؟" حاتم نے جواب دیا "تیس برس ہونے ہیں۔" انھوں نے پھر سوال کیا "اس مدت میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا ہے؟" کہنے لگے "آٹھ مسائل سیکھ لئے ہیں۔" شقیق نے غصے میں کہا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون تمہارے ساتھ میری ساری عمر کھپ گئی اور تم ہو کہ ابھی تک آٹھ ہی مسائل سیکھ سکے ہو۔"

حاتم نے جواب دیا۔

"میرے استاذ! مجھے جھوٹ بولنا پسند نہیں۔ میں واقعی ٹھیک بتا رہا ہوں کہ میں نے ان آٹھ مسائل کے سوا کچھ نہیں سیکھا۔" "اچھا بتاؤ یہ آٹھ مسائل کون سے ہیں۔ میں بھی تو سنوں" استاذ نے سوال کیا۔

حاتم کہنے لگے "میں نے مخلوق کو دیکھا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہاں ایک آدمی دوسرے آدمی سے محبت رکھتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ محب اور محبوب دونوں قبر میں جا پہنچتے ہیں۔ قبر میں جانا ان کے فراق کا موجب ہوتا ہے لہذا میں نے نیکیوں کو اپنا محبوب بنایا۔ اس لئے جب میں قبر میں جاؤں گا میرا محبوب بھی میرے ہمراہ ہوگا۔"

"حاتم! تم نے سچ کہا۔ اچھا دوسرا مسئلہ بتاؤ" شقیق نے کہا۔

حاتم نے جواب دیا "میں نے اللہ تعالےٰ کے فرمان وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ

رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى (لیکن جو شخص اپنے پروردگار کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے خواہشات سے اپنے نفس کو روکا تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگی) پر غور کیا تو اسے برحق سمجھا۔ چنانچہ میں نے اپنے نفس کے ساتھ اس قدر جہاد کیا کہ بالآخر اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے جھکا لیا۔"

"تم نے سچ کہا۔ اچھا تیسرا مسئلہ بیان کرو" شقیق نے کہا۔

حاتم نے جواب دیا "میں نے مخلوقات پر غور کیا تو دیکھا کہ جس کے قبضے میں کوئی چیز ہے اس کی نظر میں اس چیز کی قیمت بھی ہے اور اس کی قدر و منزلت اور حفاظت کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ پھر میں نے اس کلامِ الٰہی پر غور کیا کہ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے) اس کے بعد جب بھی کوئی چیز قدر و قیمت والی میرے سامنے آئی میں نے اسے اللہ ہی کی طرف لوٹا دیا تاکہ وہ خدا کے ہاں باقی رہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا چوتھا مسئلہ کیا ہے" شقیق نے پوچھا۔

حاتم نے کہا "میں نے مخلوق کے بارے میں سوچا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام لوگ حسب نسب اور شرف و مال پر پھٹکتے ہیں حالانکہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ پھر جب میں اس حکم خداوندی کی طرف متوجہ ہوا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے) تو میں نے تقویٰ کو اختیار کیا تاکہ اللہ تعالےٰ کے ہاں عزت پاؤں۔"

"تمہاری بات درست ہے۔ پانچواں مسئلہ بیان کرو" شقیق نے کہا۔

"میں نے دیکھا کہ لوگ ایک دوسرے کو مطعون کرتے اور ملعون قرار دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کے باہمی جھگڑے اور دشمنیاں ہیں۔ مجھے قرآن مجید میں یہ قول ملا کہ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (ہم نے لوگوں کے درمیان ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا) تو میں نے تمام جھگڑے ترک کر دیئے۔ لوگوں سے اجتناب کیا اور ان سے دشمنی یہ سمجھ کر چھوڑ دی کہ معیشت کی تقسیم اللہ کی طرف سے ہے۔" حاتم نے جواب دیا۔

"تم نے ٹھیک سمجھا۔ چھٹا مسئلہ کیا ہے" شقیق نے پوچھا۔

"میں نے لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرتے اور آپس میں لڑتے دیکھا تو میں خدا کے اس فرمان کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا (شیطان تمہارا دشمن ہے لہذا اس کو دشمن سمجھو) پھر میں نے صرف شیطان کو اپنا دشمن سمجھا اور چونکہ خود خدا نے اس کی دشمنی کی گواہی دی تھی اس لئے میں اس سے بچنے کی کوشش میں لگ گیا۔ مخلوق کی عداوت میں نے بالکل ترک کر دی" حاتم نے جواب دیا۔

"تم نے ٹھیک کہا۔ ساتویں بات کونسی ہے" شقیق نے دریافت کیا۔

"میں نے لوگوں کو دیکھا کہ کثرت کی طلب میں سر توڑ کوشش کرتے ہیں اور اس کی خاطر ان حدود میں بھی داخل ہو جاتے ہیں جو ان کے لئے حلال نہیں ہوتیں۔ پھر مجھے خداوند تعالےٰ کا یہ فرمان ملا کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ تعالےٰ کے ذمہ نہ ہو) چنانچہ میں نے لوگوں پر اپنے حقوق کا خیال چھوڑ دیا اور ان واجبات کا خیال کرنے لگا جو میرے اوپر اللہ تعالےٰ کے ہیں" حاتم نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کیا۔ اچھا آٹھواں مسئلہ بتاؤ" شقیق نے سوال کیا۔

میں نے لوگوں پر نظر کی تو کسی کو اپنے سر و سامان پر اور کسی کو اپنی تجارت یا صحت پر بھروسہ کئے ہوئے پایا۔ گویا مخلوق مخلوق ہی پر بھروسہ کئے ہوئے تھی۔ میں نے خدا کے اس فرمان پر عمل کیا کہ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (جس نے اللہ پر بھروسا کیا تو اس کے لئے وہی کافی ہے) چنانچہ میں نے صرف خدا پر بھروسہ کیا۔ وہی میرے لئے کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے" حاتم نے جواب دیا۔

شقیق نے کہا۔ "حاتم! میں نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن سب میں غور کیا تو اسی نتیجہ تک پہنچا کہ ہر قسم کی نیکیاں انہی آٹھ مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ جس نے ان مسائل پر عمل کیا اس نے گویا ان چاروں آسمانی کتابوں پر عمل کیا۔ اللہ تعالےٰ تمہیں بھی عمل کی توفیق دے"

تقریظ و تنقید

دینِ اسلام۔ حصہ دوم

تصنیف :- مولوی محمد علی

ترجمہ :- مرتضیٰ خاں حسن بی۔اے

شائع کردہ :- احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور۔

جماعتِ احمدیہ کے علماء میں سے ایک صاحبِ تصنیف عالم مولوی محمد علی گزرے ہیں ان کا نام قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ اور حاشیہ کے مصنّف کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی ایک کتاب THE RELIGION OF ISLAM کے نام سے انگریزی زبان میں مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے۔ احمدیہ انجمن نے اسی کتاب کا اردو ترجمہ "دینِ اسلام" کے نام سے شائع کیا ہے جس کا دوسرا حصّہ ہمیں بغرض تبصرہ بھیجا گیا ہے۔

فاضل مصنف کے پیشِ نظر اس کتاب کے لکھنے کا جو مقصد رہا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی ممالک میں اسلام کا تعارف کرایا جائے۔ اس غرض سے زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے ارکانِ اسلام کا تعارف نہایت تفصیل سے کرایا ہے۔ چونکہ کتاب غیر مسلموں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے اس میں ان چیزوں کا تعارف بھی موجود ہے جو ہمارے ہاں جانی پہچانی ہیں۔ اور جن کا بیان یہاں کے لوگوں کے لئے محض تحصیل حاصل ہے۔ مثلاً مساجد، ہیئتِ نماز، نماز جمعہ و عیدین، وضوء، غسل وغیرہ۔ مصنف بہرحال داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ارکانِ اسلام کے تمام گوشوں کو لیا ہے اور ہر وہ چیز بیان کی ہے جو ایک ناواقف آدمی کے جاننے کی ہو سکتی تھی۔ کتاب کے حاشیہ میں انہوں نے حوالے بھی بڑی کثرت سے دیئے ہیں۔ اس لئے

قاری اصل کتابوں کی طرف بآسانی رجوع کر سکتا ہے۔ قارئین کو مصنف سے فقہی اختلافات کئی جگہ ہوں گے کیونکہ وہ بسا اوقات اپنا اجتہاد بھی پیش کر دیتے ہیں۔

ہمارا تاثر یہ ہے کہ مصنف ان مواقع پر جہاں مغربی لوگوں کے لئے اسلام کے کسی حکم پر اعتراض کی گنجائش ہو سکتی تھی، اسلام کی تعلیمات کی ایسی تاویل کر دیتے ہیں جو ان کے مخاطبین کے لئے قابلِ قبول ہو سکے۔ مثال کے طور پر مساجد میں مستورات کی آمد و شد کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ ابتدائے اسلام کی اس اجازت کو اب بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں جو نمازوں میں مستورات کی شمولیت کے بارے میں دی گئی تھی۔ ان کی نظر میں مسلمانوں نے خواہ مخواہ عورتوں سے نماز باجماعت کا حق سلب کر لیا ہے۔ ایک جگہ تو انہوں نے یہ تک بھی لکھ دیا ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے بھی واقف ہیں جو نمازوں کی امامت کے فرائض ادا کرتی تھی اور مرد اس کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ افسوس کہ انہوں نے اس نادر روایت کا کوئی حوالہ نہیں دیا ورنہ ہم بھی قارئین کو اس کے منبع سے روشناس کراتے۔

مصنف نے جگہ جگہ دبی زبان سے یہ بھی بتایا ہے کہ جس زمانہ میں عورتیں نماز باجماعت ادا کیا کرتی تھیں اس وقت اس پردے کا اہتمام نہیں ہوتا تھا جو اب مسلمانوں میں رواج پا چکا ہے۔ یہاں پر ان کا یہ عمل ناقابلِ فہم ہے کہ انھوں نے اس بحث کو نظر انداز کر دیا ہے کہ پردہ کی آیات کے نزول کے بعد صحابہ کرامؓ نے مستورات کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا تھا؟

فلاح کے اصول بتاتے ہوئے مصنف خدا کی ہستی، خدا کی وحی اور یوم آخرت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں۔ صفحہ ۱۰۹ پر اسلام کے تین اعتقادی اصول بیان کرتے ہوئے بھی انہوں نے انہی تینوں چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک اس بات میں ایک مغالطہ ہے۔ ثلثِ قرآن جس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے وہ ایمان بالرسالت ہے۔ اور ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت تینوں ستونوں پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ ایمان بالرسالت کی اصطلاح میں خدا کی وحی پر ایمان شامل ہے جب کہ وحی

پر ایمان کے الفاظ کہہ کر مصنف رسول کی شخصیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ رسول کی شخصیت کو نظر انداز کر کے دین کا جو حلیہ بگڑتا ہے تو اس کے نتیجہ میں قادیانیت یا پرویزیت کے پیدا ہونے کی گنجائش تو ہوتی ہے لیکن خالص اسلام پیدا نہیں ہو سکتا۔

جہاد کے باب میں مصنف نے جہاد کا وہی فلسفہ پیش کیا ہے جو قادیانیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یعنی وہ اسلامی جنگوں کو صرف دفاعی جنگیں سمجھتے ہیں اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لئے جہاد کرنے کے نظریہ کو خلافِ اسلام نظریہ بتاتے ہیں۔ یہ موضوع چونکہ اہم ہے اس لئے ہم مصنف کے دلائل کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

مصنف کے دلائل کا زیادہ تر انحصار دو آیتوں کے انطباق پر ہے۔ ایک سورۃ بقرہ کی آیت لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور دوسرے سورۃ توبہ کی آیت فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (پھر جب عزت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں انہیں پاؤ) اول الذکر آیت سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام کی جبراً اشاعت ممنوع ہے اور اگر مسلمانوں کا فلسفہ جہاد تسلیم کر لیا جائے تو اس آیت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ دوسری آیت کو وہ ان مشرکین کے لئے خاص سمجھتے ہیں جن سے مسلمانوں کے معاہدے ہوئے تھے لیکن مشرکین نے ان معاہدوں کو توڑ دیا۔ اس عہد شکنی کے بعد مسلمانوں کو اپنے دفاع کے لئے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس جنگ کے خاتمہ کے لئے مشرکین کی طرف سے صلح کی درخواست کافی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ اگر مشرک صلح کرنا چاہیں تو تمہارے لئے بھی صلح کرنا ضروری ہے (وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا) مصنف کے نزدیک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر رہا البتہ بعد میں مسلمانوں نے اور خاص طور پر ان کے فقہاء نے نہ منشائے الٰہی سمجھا اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے صحیح نتائج اخذ کر سکے۔ اس کے نتیجہ میں جہاد کے غلط تصورات مسلمانوں میں پھیلے اور یورپی مصنفین کو ان پر اعتراض کا موقع ملا۔

ہمارے نزدیک اس بحث کی بنیاد ہی مصنف نے غلط اٹھائی ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ

فِی الدِّیْنِ کا مفہوم اس کی دوسری ہم معنی آیات کی طرح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دین کے معاملہ میں کوئی فطری جبر نہیں رکھا۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو مسلمان بنا دیتا لیکن یہ اس کی حکمت کے خلاف تھا۔ اب اس کی ہدایت دنیا میں آگئی ہے۔ گمراہی کے پردے چاک ہو چکے ہیں۔ اب ہر وہ شخص جو فطرت کی آواز پر لبیک کہے گا وہ اسلام کو اختیار کرے گا۔ اس آیت کا اس بحث کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کہ آیا دعوت کے کسی مرحلہ میں تلوار اٹھائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس بحث کے لئے قرآن مجید کی دوسری آیات حدود مقرر کرتی ہیں۔

جہاں تک سورۂ توبہ کی آیت فاذا انسلخ الاشھر الحرم ... الخ کا تعلق ہے، اس کا موقع و محل ہی مصنف نے غلط سمجھا ہے۔ اس سورہ کی پہلی دو آیات میں انہی مشرکین سے اعلانِ برأت کیا گیا ہے جنہوں نے معاہدات توڑ دیئے تھے۔ لیکن تیسری آیت میں یہ اعلانِ برأت تمام مشرکین کے لئے عام کر دیا گیا ہے اور صرف انہی قبائل کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے جو معاہدات کو نیک نیتی کے ساتھ نبھاتے رہے اور ان کا دامن مسلمانوں کے خلاف سازشوں سے داغدار نہیں تھا۔ ان مشرکین کو بھی ہمیشہ کے لئے مستثنیٰ نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ ان کے لئے یہ رعایت صرف اسی مدت تک ہے جس مدت تک ان کے ساتھ معاہدات ہو چکے ہیں۔ ان آیات میں مشرکین کے خلاف اعلانِ جنگ کا حکم بالکل واضح ہے اور صلح کی درخواستوں کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ جنگ ختم ہونے کی واحد صورت یہ بتائی گئی ہے کہ مشرک ایمان لائیں اور نماز و زکوٰۃ قائم کرنے لگ جائیں۔

ان آیات پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے آیت نمبر ۳ کے اعلانِ برأت، معاہد مشرکین کے لئے اتموا الیھم عھدھم الی مدتھم کی پابندی اور فخلوا سبیلھم کی شرائط سے کلیۃً صرفِ نظر کیا ہے حالانکہ اس بحث میں یہی پہلو فیصلہ کن تھے۔

آگے کی وہ آیات جن میں مشرکین کے جرائم بتائے گئے ہیں (مثلاً نقضِ عہد، اخراجِ مسلمین وغیرہ) محض اظہارِ امرِ واقعہ کے طور پر ہیں۔ ان کے بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان جرائم کے مرتکب مشرکین ہی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا تھا درست نہیں۔ اس تفصیل سے یہ اندازہ ہو گا کہ مصنف نے قرآن مجید کی آیات کو بالکل غلط معنی پہنائے ہیں جس کے نتیجہ میں

ان کی یہ بحث ایک غلط نہج پر چل گئی ہے۔

مندرجہ بالا وضاحت کے بعد حدیث امرت ان اقاتل الناس ..... الخ سورۂ توبہ کی آیت ۵ کی تفسیر کرتی معلوم ہو گی حالانکہ مصنف نے اپنے نظریہ کو باقی رکھنے کے لئے یہ تک لکھ دیا ہے کہ:-

"اس حدیث کا مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں سے جنگ جاری رکھیں جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں۔"

اس بحث میں مصنف ایک بنیادی امر کو ملحوظ نہیں رکھ سکے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرضِ منصبی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ دوسرے ادیان پر اسلام کو غالب کریں گے (ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ) اسلام کے اس غلبہ کے لئے آنحضورؐ کو جس طریقہ کی تعلیم دی گئی، اس میں ابتدائی مرحلہ دعوت کا تھا۔ اس مرحلہ میں صبر و ثبات کے ساتھ کام کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہجرت کے بعد حضورؐ کو اپنے دفاع کی اجازت ملی اور جب اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور ان مشرکین پر اتمامِ حجت ہو چکا جن کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے تو آپ کو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس حکم کے بعد آپ نے مکہ پر چڑھائی کی اور اسے فتح کیا۔ اسی غلبہ دین کے حکم ہی کی بنا پر آپ نے یہ ہدایت فرمائی کہ جزیرہ عرب میں کوئی مشرک باقی نہ رہنے پائے۔ مصنف نے یہ جو لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین نے مشرک قبائل کے ساتھ حمایت کے معاہدے کئے ہوئے تھے، اس کا ثبوت ہمیں تاریخ سے نہیں ملا اور نہ ہی مصنف کا حاشیہ اس بیان کے حق میں ہے۔

اللہ کے دین کی اشاعت کے لئے تلوار کا استعمال خود منشائے الٰہی تھا اور خلفائے راشدین نے اسی منشاء کے مطابق دوسری قوموں کے سامنے اسلام، جزیہ یا تلوار کی شرائط پیش کیں۔ دعوتِ اسلام کے اس اختصار کی وجہ بھی یہی تھی کہ اب خدا کا دین غالب آ کر تمام ہو چکا تھا اور اس کی مزید وضاحت کی حاجت باقی نہ رہی تھی۔

مصنف فقہاء کی بیان کردہ قتل مرتد کی سزا پر بھی پیچ بحثیں ہوئے ہیں اور یہاں بھی وہی بنیادی غلط فہمی کام کر رہی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم اس بحث اور چند دوسرے ضمنی مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں۔

کتاب کی فصل سوم میں وضو، مسواک اور غسل و تیمم وغیرہ کا ذکر ہے لیکن مصنف نے اس پر عنوان "تزکیہ نفس" کا لگایا ہے۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

کتاب کا ترجمہ رواں ہے۔ یہ مجلد ہے اور بڑے سائز کے ۲۰۲ صفحات کو محیط ہے۔ اس کی قیمت کہیں درج نہیں کی گئی۔　　(خ۔م)

(بقیہ صفحہ ۴)

لیکن اگر یہ حضرات اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہیں تو پھر سلامتی اسی میں ہے کہ جہاں تک جا چکے ہیں وہیں سے پیچھے مڑنے کی کوشش کریں اور کسی مفید کام میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کریں۔ اگرچہ اب اس نقصان کی تلافی تو نہیں ہو سکتی جو اسلام کے وقار کو اس ملک میں پہنچ چکا ہے، تاہم تجربہ سے فائدہ اٹھانا خیر سے خالی نہیں ہوگا۔

ماہنامہ

میثاق

کی جلدیں

جن حضرات کو "میثاق" کی پرانی جلدیں مطلوب ہوں وہ فوراً اپنے آرڈر ارسال فرمائیں۔ اس وقت دو تین شماروں کے سوا تمام تمام پرچے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ فرمائش میں تاخیر کر کے اس گراں قدر چیز سے محروم نہ رہیے۔

قیمت فی شمارہ (۶۰) ساٹھ پیسے پرانے یا نئے مستقل خریداروں کو ہر پرچہ پچاس پیسے ہی میں دیا جائے گا۔

منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ، اچھرہ
لاہور ۔ ۱۲

محی الدین پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق ۵۔اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے شائع کیا۔